'اس طرف کیا تکتی ہے' سالی؟ تیرا کوئی خصم ہے ادھر؟'.....

امریک سنگھ نے کرپان کی نوک سے دلشاد کی پسلیوں کو گدگدایا' اور رہا یاں گال کھینچ کر اس کا منہ پچھم سے پورب کی طرف گھما دیا۔

دلشاد مسکرا دی۔ یہ مسکراہٹ اسکا خاصہ بن گئی تھی۔ بچپن میں اسکا کامیاب ترین ہتھیار اسکا رونا تھا۔ ایک ذرا ریں ریں' راں راں کر کے وہ ماں کے سینے میں چھپائے دودھ سے لے کر الماری میں رکھی ہوئی برفی تک ہر چیز کو حاصل کر لیا کرتی تھی۔ اب جوانی نے اس کی مسکراہٹ میں اثر پیدا کر دیا تھا۔ اس نئے جادو کا علم اس کو اس وقت ہوا جب اسکی ایک مسکراہٹ پر نثار ہو کر رحیم خان نے قسم کھائی تھی کہ اگر چاند یا سورج یا تارے بھی اسے اٹھا لے جائیں تو وہ ارض وسما کا وسعتیں پھاند کر اسے چھین لائے گا۔

رحیم خان جھوٹا تھا۔ مکار کہیں کا۔ آسمانوں کی بات تو دور کی بات تھی وہ تو اسے زمین پر ہی کھو بیٹھا۔ دلشاد نظر بچا بچا کر قبلہ رو ہو بیٹھتی تھی اور خیال ہی خیال میں اپنی جبیں کو اس آستانے پر جھکا دیا کرتی تھی' جس کے دامن میں رحمتوں اور نعمتوں کی ایک بے کراں دنیا پوشیدہ بتائی جاتی تھی۔ مغرب کی طرف کعبہ تھا۔ کعبہ اللہ میاں کا گھر تھا۔ اس گھر کا تصور دلشاد کے دل میں عقیدت اور امید کا ایک تابناک چراغ روشن کر دیتا تھا۔ لیکن امریک سنگھ کو پچھم سے بڑی چڑ تھی۔ یوں بھی سکھوں کی اس بستی میں چند رواج بڑے ٹیڑھے تھے' ایک کریلا اور دوسرے نیم چڑھا۔ بارہ سے بارہ بجے تک انکے اعصاب کمان کی طرح تنے رہتے تھے اور یوں معلوم ہوتا تھا گویا کسی نے بستی بھر کے بچوں' جانوں اور بوڑھوں کو بجلی کے تار میں پرو کر برقا دیا ہے۔

امریک سنگھ کا گھر مسجد کے عقب میں واقع تھا۔ اس مسجد کے دامن میں ایک بھیانک سا واہمہ پرورش پا رہا تھا۔ گاؤں بھر میں یہ بات پھیل رہی تھی کہ سر شام ہی مسجد کے کنوئیں سے عجیب عجیب ڈراؤنی آوازیں سنائی دینے لگتی ہیں..... جیسے دو چار بکریوں کو بیک وقت ذبح کیا جا رہا ہو۔

'سالا حرامی' امریک سنگھ کہا کرتا تھا۔ 'مرنے کے بعد بھی ڈکرا رہا ہے بھینسے کی طرح۔ ڈال دو کچھ ٹوکرے کوڑے کے کنوئیں میں۔'

'ارے چھوڑو بھی' امریک سنگھ کا بھائی ترلوک سنگھ مذاق اڑاتا تھا۔ 'بانگ دے رہا ہے ملا بانگ۔'

'خالصہ جی کے راج میں دھرم کی پوری پوری آزادی ہے..... ہاں' گیانی دربار سنگھ جبڑے پھاڑ کر ہنستا۔

لیکن امریک سنگھ کی بیوی ڈرتی تھی۔ رات کو سناٹے میں جب مسجد کا کنواں گلا پھاڑ پھاڑ کر چنگاڑتا تو اسکا تن بدن ٹھنڈے پسینے میں شرابور ہو جاتا۔ اسکی آنکھوں کے سامنے ملا علی بخش کی تصویر آ جاتی' جو مسجد کے حجرے میں رہا کرتا تھا' نحیف بدن' دو ہاتھ کی لمبی داڑھی' آنکھوں پر موٹے گلاس کا چشمہ' سر پر سبز ململ کی بے ڈھب سی پگڑی' ہاتھوں میں رعشہ' گردن میں ابھری ہوئی رگیں۔ لیکن جب وہ صحن میں کھڑا ہو کے پانچ وقت اذان دیتا تو مسجد کے گنبد گونج اٹھتے اور علی بخش کے نحیف ونڈھال گلے سے وہ زنانے کی آواز نکلتی جیسے بہت سی آبشاریں دست بداماں ہو کر گونج رہی ہوں۔

اذان کی آواز سے امریک سنگھ کی بیوی کو بڑی کوفت ہوتی تھی' ایک وقت یا دو وقت کی بات ہوتی تو خیر' لیکن جب دن بھر میں پانچ بار اسے یہی بول سننا پڑتے تو وہ گھبرا جاتی۔ اسنے بڑے بزرگوں سے سن رکھا تھا کہ اذان میں کالے جادو کے بول ہوتے ہیں اور جوان عورتیں اسے

سن کر 'بانگی' جاتی ہیں۔ اگر بن بیاہی نوخیز لڑکی بانگی جائے تو اسکے بانجھ ہونے کا ڈر تھا۔ اگر بیاہی ہوئی بیوی بانگی جائے تو اسکے حمل گرنے لگتے تھے! چنانچہ امریک سنگھ کے گھر میں پشت ہاپشت سے یہ رسم تھی کہ ادھر اذان کی آواز فضا میں لہرائی ادھر کسی نے کٹورے کو چمچے سے بجانا شروع کیا۔ کسی نے چمٹے سے لڑایا۔ کوئی کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر بیٹھ گئی' کوئی بھاگ کر پچھلی کوٹھڑی میں جا گھسی..... اور اس طرح بہادر خاندان اپنی لاڈلیوں کی کوکھ کو کالے جادو کے اثر سے بچا کر ہرا بھرا رکھتا آیا تھا۔

امریک سنگھ کی بیوی کے بطن میں سوا لاکھ خالصے پرورش پا رہے تھے۔ سکھوں کی گنتی میں ایک سکھ سوا لاکھ انسانوں کے برابر شمار ہوتا تھا۔ آدھی رات گئے جب مسجد کا کنواں امریک سنگھ کی بیوی کے تصور میں بھیانک اور ہولناک گونج بن کر ڈکارتا تو اسکے پیٹ میں خالصوں کی یہ فوج ہڑبونگ مچانے لگتی۔ کبھی اسکے کانوں میں کنوئیں کی چنگھاڑیں جگر خراش انداز سے گونجتیں۔ کبھی اسکے تصور میں کنویں کا دھانہ جبڑے پھاڑ کر اسکی طرف لپکتا اور ہر وقت اسے یہ دھڑکا سا لگا رہتا کہ ملا علی بخش کنویں کی دیوار کے ساتھ رینگتا ہوا باہر نکل رہا ہے اور چشم زدن میں کنویں کی منڈیر پر کھڑا ہو کر نہ جانے کس وقت اسے 'بانگ' کے رکھ دے گا۔

امریک سنگھ کی بہن کے بطن میں تو ابھی کسی خالصے نے اپنا گھر نہیں جمایا تھا۔ کیونکہ وہ ابھی بن بیاہی تھی' لیکن اسکے دل پر سوا لاکھ کا قبضہ تھا رات کو جب وہ اپنی چارپائی پر لیٹ کر ان میٹھی میٹھی گدگدیوں کو یاد کرتی جو مکئی کے کھیتوں کی اوٹ میں سوا لاکھوں کی بھوکی انگلیاں اس کے تن بدن کو چھلنی بنا کر رکھ دیتی تھیں تو اسکے سینے میں ارمانوں کا ایک ہجوم سا امڈ آتا اور وہ تصور میں اپنے جسم کو جوان جوان' قوی قوی خالصوں کے وجود سے آباد کر لیتی..... لیکن پھر مسجد والیز کنویں کی دلدوز چنگھاڑ اسکے ایوان تصور کو مسمار کر کے رکھ دیتی اور معاً اسے محسوس ہوتا کہ کنویں کی عمیق گہرائی سے بھی ملا علی بخش کالے جادو کے بول پکار پکار کر اسے پیٹ سے چلنے والی نسل کے ناکے بند کر رہا ہے۔

امریک سنگھ کو اپنی بیوی اور بہن دونوں پر بڑا غصہ آتا تھا۔ بزدل کی بچیاں ملا علی بخش تو کب سے دو ردفعان ہو چکا تھا۔ جس روز وہ کنویں کی منڈیر پر بیٹھا وضو کر رہا تھا۔ امریک سنگھ نے خود اسے نیزے کی نوک پر اچھالا' تر لوک سنگھ نے اسکو اپنی تلوار پر آزمایا' گیانی دربار سنگھ نے اسکے جھنجھناتے ہوئے خون آلود جسم کو تڑاخ سے کنویں میں پھینک ڈالا۔

ایک ملا علی بخش پر ہی کیا منحصر تھا۔ اب تو چمکور کا سارا گاؤں صاف ہو چکا تھا۔ بانگیں دینے اور سننے والوں کا وجود ناپید ہو گیا تھا۔ کچھ بھاگ گئے تھے' کچھ مر گئے تھے اور بہتوں کی گردن پر خالصوں کی مقدس کرپانیں سجدہ ریز ہو چکی تھیں..... لیکن یہ ڈرپوک حرام زادیاں تھیں کہ اب بھی وہی بانگوں کے ڈر سے اپنے بچہ دانوں کو چھپائے چھپائے پھرتی تھیں۔ چنانچہ جب امریک سنگھ کی بیوی اور بہن سوتے سوتے چیخ کر چھاتیاں پیٹنے لگتیں تو اسکا دل طیش سے جل کر کباب ہو جاتا اور وہ چمٹا اٹھا کر انہیں مار مار کر لہولہان کر دیتا۔ مارتے مارتے اسکے ہاتھ شل ہو جاتے' بازوؤں میں تھکن آ جاتی' رگیں پھول جاتیں اور وہ اپنی داڑھی سے پسینے کے قطروں کو جھاڑتا ہوا دیوانوں کی طرح لپک کر دلشاد کے پاس چلا جاتا۔ جس طرح دائمی زکام کا مریض دماغ کی ریزش کو ہلکا کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً نسوار سونگھ لیا کرتا ہے' اسی طرح گاؤں بھر کے خالصے اپنی وہم آلود بیویوں اور بہنوں سے بھاگ کر اپنے بدن کا فشار خون دھیما کرنے کے لیے دلشاد کے پاس چلے جایا کرتے تھے۔ دلشاد کو مسجد میں رکھا گیا تھا کیونکہ حجرے کی چھت جل جلا کر گر چکی تھی۔ یوں تو اسکے سرمائے میں اسکا جسم بھی تھا اور جان بھی۔ لیکن اسکا عزیز

ترین سرمایہ اسکے ابا کی تسبیح تھی۔ ملاعلی بخش کے ہاتھ اسی تسبیح پر گھومتے گھومتے بوڑھے ہو گئے تھے۔ پتھر کے گول دانوں پر اسکی انگلیوں کے نشان نقش فریادی کی طرح پیوستہ تھے۔ سالہا سال کے گریہ نیم شبی اور فغان سحری کے آنسو اس تسبیح میں موتیوں کی طرح پروئے ہوئے تھے۔ یہی چند موتی تھے جنکے وجود سے دلشاد کا لٹا ہوا صدف ابھی تک آباد تھا..... وہ دن بھر اس تسبیح کو گلے میں ڈال کر قمیض کے نیچے چھپائے رکھتی تھی لیکن شام پڑتے ہی اسے کسی ویران کونے میں دبا دیتی تھی' کیونکہ اسے ڈر تھا کہ کہیں بھنگ اور شراب میں سموئی ہوئی زبانیں اسکے ابا کی انگلیوں کے نقوش کو بھی چاٹ چاٹ کر ناپاک نہ کر دیں۔

آدھی آدھی رات گئے وہ مسجد والے کنویں کی منڈیر پر رویا کرتی تھی۔ اسکی آنکھیں کنویں میں ٹکٹکی لگائے پک جاتی تھیں کہ شائد کبھی اسکے ابا کی تیرتی ہوئی پگڑی کی ایک جھلک اسے دکھائی دے' اسکے کان کنویں کی طرف لگے لگے تھک جاتے تھے کہ شائد کبھی اسکے ابا کی آخری سسکی اسے ایک بار پھر سنائی دے وہ خوفناک چنگھاڑیں جنہوں نے گاؤں بھر کی عورتوں کو پریشان کر رکھا تھا' شائد اسکے منتظر کانوں کو بھی نواز دیں..... لیکن کنواں تاریک تھا اور قبر کی طرح خاموش۔ جب کوئی آوارہ چمگادڑ اس میں پر پھڑ پھڑاتی 'تو..... ہر پھڑ پھڑاہٹ کے ساتھ بدبو اور تعفن کے تیز تیز بھبکے فضا میں منتشر ہو جاتے تھے۔ کیونکہ سوا لاکھ بہادروں نے ملاعلی بخش کا گلا مرنے کے بعد بھی بند رکھنے کے لئے کنویں کو غلاضت اور کوڑے کرکٹ سے اٹا اٹ بھر دیا تھا۔

دلشاد کا وجود ایک ٹوٹے ہوئے تارے کی طرح تھا کہ جس کے ٹکڑے آسمان کے ویرانوں میں اکیلے ہی اکیلے بھٹک رہے ہوں۔ آسمان کی بساط لٹ چکی تھی۔ سورج اور چاند چھپ گئے تھے۔ تاروں کے چراغ بجھ گئے تھے اور وہ اکیلی رہ گئی تھی۔ بے یار و مددگار۔ مسجد کے دروازے کے ساتھ لگی ہوئی' سہمی ہوئی' حیران..... لیکن اسکے دم سے مسجد پھر آباد ہو گئی تھی۔ لوگ باریاں باندھ کر وہاں آتے تھے اور جب وہ بہادر خالصے محراب کے نیچے بیٹھ کر شراب کا ادھیا کھولتے اور دلشاد کی بوٹیوں کو چچوڑ چچوڑ کر کھانے کی کوشش کرتے 'تو گویا انہیں یہ فخر ہوتا کہ وہ گن گن کر ساڑھے تیرہ سو برس کی اذانوں اور نمازوں کا بدلہ چکا رہے ہیں۔

چمکور کی مسجد گردواروں سے بھی زیادہ آباد ہو گئی تھی۔ رفتہ رفتہ گاؤں کی بیاہی ہوئی اور بن بیاہی ہوئی ماؤں کو یہ احساس ستانے لگا کہ ملاعلی بخش کے بعد ملاعلی بخش کی بیٹی ان کی کوکھ لوٹنے پر تلی ہوئی ہے۔ وہ تو چمٹے کھا کھا کر اپنی چارپائیوں سے لگ کر سو جاتی تھیں لیکن انکے بہادر خالصے رات رات بھر دلشاد کے ساتھ اپنی آنے والی نسل کا سودا کیا کرتے تھے۔

امریک سنگھ' امریک سنگھ کا باپ' امریک سنگھ کا بھائی..... ایک خالصے کے بعد دوسرا خالصہ' دوسرے خالصے کے بعد تیسرا خالصہ..... رات بھر وہ نظریں بچا بچا کر' موقع جانچ جانچ کر مسجد کے آستانے پر حاضری دیتے تھے۔ بھنی ہوئی کلیجی اور گردے اڑاتے تھے۔ تلے ہوئے کبابوں کا دور چلتا۔ شراب اور بھنگ کی بالٹیاں بٹتیں اور اپنی نسل بندی کے وہ بیج جن کو ہرا بھرا رکھنے کے لئے ان کی بیویاں سو طرح کے جتن کرتی تھیں' وہ بلا دریغ مسجد کی چار دیواری میں بکھیر آتے..... اور ایک دن بیٹھے بٹھائے یکا یک دلشاد مرسوں کی طرح پھول اٹھی۔ جب یہ خبر پھیلی گاؤں میں آگ سی لگ گئی۔ بیویوں نے چیخ چیخ کر اپنا سر پیٹ لیا۔ کنواری لڑکیوں نے رو رو کر آنکھیں سجالیں اور مکئی کے کھیتوں میں چھپ چھپ کر اپنے خالصوں سے ملنا چھوڑ دیا۔ کنویں کی چنگھاڑیں تیز تر ہونے لگیں۔ گھروں میں فٹ پر فٹ آنے لگے۔ چمٹے پر چمٹے چلنے

لگے' ایک کہرام سا مچ گیا۔

پہلے تو سب کی یہ رائے ہوئی کہ بچا پیدا ہونے سے پہلے ہی دلشاد کو مار کے کنویں میں پھینک دیا جائے۔ لیکن پھر امریک سنگھ کو ایک مفید ترکیب سوجھی۔ آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔ ایک روز صبح سویرے وہ اسے اپنی بیل گاڑی پر بٹھا کے پاس کے تھانہ میں لے گیا اور اغوا شدہ مسلمان عورتوں کی برآمدگی کے سلسلے میں اپنی کوششوں کا عملی ثبوت دینے کے لئے دلشاد کو پیش کر دیا۔

تھانیدار لبھو رام نے امریک سنگھ کی کارگزاریوں کو خوب سراہا..... پولیس کی طرف سے شکریہ کا ایک پروانہ اسے عطا کیا اور ڈپٹی کمشنر بہادر سے بھی سند دلوانے کا وعدہ فرمایا..... پھر تھانیدار صاحب نے عینک اٹھا کر دلشاد کا جائزہ لیا۔ قبول صورت' جوان' ذرا پیلی سی' لیکن گرم گرم گداز..... لیکن جب اسکی نظر دلشاد کے پیٹ پر پڑی۔ تو انکی ابھری ہوئی امیدوں کو ایک زبردست دھکا لگا۔ پہلے تو انہوں نے سوچا کہ اگر دس بیس دن کی بات ہو تو وہ اسے ابھی تھانہ میں ہی رکھ لیں۔ لیکن جب ہیڈ کانسٹیبل نے جوڑ توڑ کے حساب لگایا کہ ابھی 'خلاص' ہونے میں تین ساڑھے تین مہینے باقی ہیں تو تھانیدار لبھو رام کو بڑی مایوسی ہوئی۔ پھر بھی رات کو کھانا کھا کر جب وہ ایک پتلی سی بنیان اور جانگیہ پہن کر چارپائی پر لیٹے تو انہوں نے دلشاد کو پاؤں دبانے کے لئے اپنے پاس بلا لیا۔ جاتے چور کی لنگوٹی ہی سہی۔ تھانیدار صاحب کے پاؤں کا درد بڑھتے بڑھتے پنڈلیوں میں آ گیا پھر گھٹنوں میں۔ پھر رانوں کے اندر' پھر کولہوں کے آس پاس..... اور وہ دلشاد کا ہاتھ پکڑ کر اپنی دکھتی ہوئی رگوں کا درد بتاتے رہے۔ تھانیدار لبھو رام کے نزدیک خواہش کا دوسرا نام تسکین تھا۔ چناں ہوا تو کیا ہوا' چنیں ہوا تو کیا ہوا؟

دلشاد کے لئے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ پچھلے چند مہینوں میں اس نے زندگی کے پیچ کچھ اس طرح کھولے تھے کہ اس کے بدن کی بوٹی بوٹی گویا مرہم کا پھاہا بن گئی تھی۔ جو کوئی اسے جہاں سے جی چاہتا لگا لیتا اور اسکے جسم کا ہر حصہ بھڑکتے ہوئے' ہانپتے ہوئے' بے چین انسانوں کو چند ہی لمحوں میں تسکین کا جام پلا دیتا تھا۔ لیکن اسکی اپنی رگ رگ میں کتنے پھوڑے تھے' کتنی ٹیسیں تھیں' کتنے رستے ہوئے زخم تھے' کاش! رحیم خاں ہوتا تو دیکھتا۔

دلشاد کو اپنے آپ پر بھی غصہ آتا تھا کہ اس نے بیچارے رحیم خاں کو اتنی بار ناحق مایوس کیا تھا۔ ایک روز جب اس نے اسے زبردستی چومنے کی کوشش کی تھی تو دلشاد نے غصہ سے اس کے سر پر ایسا دوہتڑ مارا تھا کہ اسکی چوڑیاں ٹوٹ کر رحیم خاں کے ماتھے میں گڑ گئی تھیں' اور وہ خود ساری رات انگاروں پر لوٹتی رہی تھی کہ نہ جانے خدا اور رسول رحیم خاں کو اس گناہ کی کیا سزا دیں گے؟ بیچارہ رحیم خاں!

پندرہ بیس دن کے بعد جب تھانیدار لبھو رام کے گھٹنوں اور کولہوں اور کمر کا درد ذرا کم ہوا تو انہوں نے دلشاد کو چھٹی دی اور ہیڈ کانسٹیبل دریودھن سنگھ کے ساتھ اسے انبالہ کیمپ بھیج دیا گیا۔ راستہ میں ہیڈ کانسٹیبل دریودھن سنگھ کے کولہوں اور گھٹنوں میں بھی کئی بار درد اٹھا۔ لیکن دلشاد بڑی تندہی سے اسکے درد کا مداوا کرتی گئی اور دس گھنٹے کی مسافت انہوں نے دس بارہ دنوں میں بخیر و عافیت طے کر لی۔

انبالہ کیمپ میں بہت سی لڑکیاں تھیں' بہت سی عورتیں۔ جوان بھی' لیکن ٹوٹے ہوئے تاروں کی طرح' کہ جن کے شر بجھ گئے ہوں' جن کی کہکشاں لٹ گئی ہو' جن کی تنویروں پر کیچڑ مل دیا گیا ہو۔

ہر روز فوج کے ٹرک آتے تھے اور نئی نئی لڑکیوں اور نئی نئی عورتوں کو انبالہ کیمپ میں چھوڑ جاتے تھے۔ ناموس اور تقدس کی تسبیح کے یہ بکھرے

موتی پھر اپنے مرکز کی طرف جمع ہو رہے تھے۔لیکن ابھی ان پر اپنے 'سبحان' اپنے 'غفور الرحیم' اپنے 'پاک پروردگار' اپنے 'قادر مطلق' کی حمد کا وظیفہ شروع نہ ہوا تھا۔ بلکہ کیمپ کمانڈر میجر پریتم سنگھ اور اسکے جوانمرد سپاہی ابھی تک ان پر گرد کی بانی چپتے تھے۔خیر دلشاد کو اب ایک قسم کی چھٹی تھی۔یوں تو نیک اولاد ہمیشہ ہی اپنے ماں باپ کا سہارا ہوتی ہے لیکن دلشاد کو اپنے ہونے والے بچے پر بڑا ہی بھروسہ تھا کہ اسنے پیدا ہونے سے پہلے ہی اپنی مجبور ماں کو اپنی حفاظت میں لے رکھا تھا۔

انبالہ کیمپ کے پہلو میں ریلوے لائن تھی۔سورج کی روشنی میں ریل کی پٹڑیاں چاندی کے تار بن کر چمکتی تھیں اور دور، بہت دور مغرب کی طرف ان کی نقرئی لڑیاں خوابوں کے سہانے جزیروں میں گم ہو جاتی تھیں کہ انکا دوسرا سرا مشرقی پنجاب میں نہیں مغربی پنجاب میں ہے!

مغربی پنجاب مغرب کا خیال آتے ہی دلشاد کی راکھ میں ایک ننھا سا چراغ ٹمٹما اٹھتا۔

مغرب میں کعبہ ہے۔کعبہ اللہ میاں کا اپنا گھر ہے۔لیکن کیمپ کی دوسری عورتیں کہتی تھیں کہ مغرب میں اور بھی بہت کچھ ہے۔وہاں ہمارے بھائی ہیں، ہماری بہنیں ہیں، ہمارے ماں باپ ہیں۔وہاں عزت ہے۔وہاں آرام ہے..... دلشاد سوچتی تھی کہ شائد وہاں رحیم خاں بھی ہو! یہ خیال آتے ہی اسکے جسم کا رواں رواں مچل اٹھتا اور وہ بے چین ہو جاتی کہ پر لگا کر اڑ جائے اور اپنے تھکے ہوئے، دکھے ہوئے جسم پر اس ارض مقدس کی خاک مل لے۔

ہفتہ، دو ہفتے، مہینہ، دو مہینے..... دن گزرتے گئے۔راتیں بیتتی گئیں اور مغرب کا خوش آئند تصور دلشاد کے سینے میں امیدوں کا نور پھیلاتا رہا۔ انبالہ کیمپ کی آبادی بڑھتی گئی۔اور جب میجر پریتم سنگھ اور اسکے جوانوں کا دل اچھی طرح سیر ہو گیا تو ایک دن وہ ریل بھی آ گئی جس کے انتظار میں امیدوں کے چراغ ابھی تک جل رہے تھے جب وہ ریل کے ڈبے میں سوار ہوئی، تو دلشاد کو ملا علی بخش کی یاد آئی وہ بھی اسی طرح ریل گاڑی میں بیٹھ کر حج کو روانہ ہوا تھا۔گلے میں ہار تھے، کپڑوں پر عطر تھا اور گاؤں کے لوگ باجا بجاتے ہوئے اسکے ساتھ اسٹیشن تک آئے تھے.....!

ریل کے ہر فراٹے کے ساتھ عورتوں کے ٹوٹے ہوئے آبگینے جھنجلا اٹھتے تھے۔پہیوں کی ہر گردش کے ساتھ ان کے جسم اور روح کا ایک بل نکل جاتا تھا۔جب وہ کھڑکیوں سے جھانک جھانک کر تار کے کھمبوں کو دیکھتیں جو بڑی سرعت کے ساتھ پیچھے کی طرف بھاگ رہے ہوتے، تو انہیں یقین سا ہو جاتا کہ وہ آگے ہی کی طرف جا رہی ہیں۔زمین کا جو چپہ چپہ ان کے نیچے سے نکلتا وہ انہیں مشرقی پنجاب سے اٹھا کر مغربی پنجاب کے قریب تر لے جاتا۔اگر کہیں گاڑی رکتی، تو ساری کائنات دم سادھ لیتی۔وقت کی رفتار ساقط ہو جاتی اور انہیں یہ ڈر لگتا کہ شائد انجن کے سامنے اچانک بڑے بڑے پہاڑ آ گئے ہیں۔جب گاڑی دوبارہ چلتی تو دل کی دھڑکنیں جاگ اٹھتیں، سینوں کے ارمان تازہ ہو جاتے اور وہ کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال نکال کر اس ہوا کو چھونے کی کوشش کرتیں، جو مغرب کی سمت سے آ رہی تھی!

لدھیانہ، پھلور، جالندھر..... امرتسر..... ہر منزل پر عورتوں کی زندگی کے بند کھلتے گئے۔ان کی خاک میں سوئے ہوئے نغمے بیدار ہونے لگے۔وہ گنگنانے لگیں۔وہ مسکرانے لگیں۔وہ آنکھیں مل مل کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔جیسے کسی بھیانک خواب کو بھلانے کی کوشش کر رہی ہوں۔کسی نے بالوں میں کنگھی کی۔کسی نے دوپٹہ کے ساتھ دانتوں کی میل اتاری۔کوئی کپڑے جھاڑنے لگی۔کوئی بچوں کو لوریاں

سنانے لگی ۔کچھ عورتوں نے سر سے سر جوڑ کر گیت گائے ۔ پیارے پیارے رس بھرے 'دلربا گیت' کہ 'اے کالی کملی والے ۔میں تیری یثرب نگری میں آئی ہوں' ..... 'مجھے اپنی کملی میں چھپالے ۔ مجھے اپنے پاؤں کی خاک بنالے .....'

جب امرتسر کے اسٹیشن سے نکلی 'تو کسی نے کہا کہ اب صرف ڈیڑھ گھنٹے کا سفر اور ہے ۔بس ڈیڑھ گھنٹہ اور! ساٹھ اور تیس 'نوے منٹ! یہ ناقابل یقین خیال عورتوں کے تن بدن پر شراب کے تیز و تند نشے کی طرح چھا گیا ۔اپنی منزل کو اتنا قریب پا کر وہ شدت احساس سے مفلوج سی ہو گئیں ۔پچھلے بھیانک مہینوں کی یاد زہر بن کر انکے سینوں میں عود کر آئی ۔ ماضی کی ہولناک حقیقت مستقبل کے سہانے ارمانو پر غالب آ گئی ۔یکا یک ان کو اپنے شاداب گاؤں یاد آنے لگے ۔اپنے جوان جوان بھائی اپنے نحیف نحیف ماں باپ' جنکے بے گور و کفن لاشے گلیوں میں پڑے سڑ رہے تھے ۔اپنی اداس اداس بہنیں جو کیمپوں میں بیٹھیں فرشتوں کا انتظار کر رہی تھیں کہ وہ انہیں اپنے نوری پروں میں چھپا کر لے جائیں ۔دور' کہیں بہت دور 'مغرب کی طرف ..... وہ رونے لگیں ۔انکے گالوں پر آنسوؤں کے پرنالے بہنے لگے ۔دلشاد بھی رو رہی تھی' بلک بلک کر سسک سسک کر اور آنسوؤں کا نمکین پانی اسکے ہونٹوں پر پہاڑی چشموں کی طرح ابل رہا تھا ۔وہ روتی گئی 'وہ روتی گئی اور اشکوں کی دبیز چادر نے اسکی پلکوں کو اپنے دامن میں چھپالیا ۔ایک عجیب سی غنودگی 'ایک عجیب سا خمار اسکے روئیں روئیں پر چھا گیا ۔اسے یوں محسوس ہونے لگا کہ وہ سمندر کی اتھاہ لہروں میں غوطے کھا رہی ہے اور بیشمار سنپولئے اسکے تن بدن پر رینگ رہے ہیں ..... رینگ رہے ہیں !!

جب اسکی آنکھ کھلی تو ریل کا ڈبہ خالی ہو چکا تھا۔ اسٹیشن کی ایک مہترانی ڈبے کے فرش کو پانی سے دھو رہی تھی۔ دلشاد کے پہلو میں ایک ننھی سی بچی رو رہی تھی۔ صبح کی فضا سورج کی کنواری کرنوں میں نہا رہی تھی درختوں پر چڑیاں پھدک رہی تھیں۔ گھاس پر شبنم کے موتی چمک رہے تھے' اسٹیشن پر چہل پہل تھی۔ ایک گرم چائے والا کھڑکی کے پاس خوانچہ لگائے دودھ ابال رہا تھا۔

دلشاد اٹھ کر کھڑکی کے سہارے بیٹھ گئی۔ اس نے نقاہت سے چائے والے سے پوچھا۔ 'کیا یہ مغرب ہے بھائی؟'

چائے والا اپنے پیلے پیلے کریہہ المنظر دانت نکال کر ہنسا 'کیوں؟ کیا نماز پڑھو گی اس وقت؟'

اسٹیشن کی مہترانی جب ڈبے کے فرش کو دھو چکی تو اسنے اپنی محنت کے صلے میں دلشاد سے ایک چونی مانگی۔ پھر مایوس ہو کر اسنے دلشاد کو چند غلیظ گالیاں دیں۔ 'سارا ڈبہ پلید کر دیا رانڈ نے' ذرا صبر نہیں ہو سکا؟ راستے میں ہی جن بیٹھی.....!' اسٹیشن کی مہترانی جا کر ایک مضبوط سے مہتر کو اپنے ساتھ لے آئی اور دونوں نے مل کر دلشاد کو ڈبے سے نکال دیا۔

پلیٹ فارم پر ایک سامان لادنے والا ٹھیلا کھڑا تھا۔ دلشاد اسکے ساتھ پیٹھ لگا کر بیٹھ گئی۔ سامنے چائے کا اسٹال تھا۔ تانبے کے چمکدار سماوار سے ابلتے ہوئے چائے کے بھبھکے بیچ در بیچ نکل رہے تھے جیسے کسی نازنیں کے گیسو ہوا کے دوش پر لہرا رہے ہوں۔ اسکے آگے پھلوں کی دوکان تھی۔ رنگ برنگ کاغذوں پر کندن کی طرح دمکتے ہوئے کیلے سنگترے اور مالٹے سجائے رکھے تھے۔ ایک کٹا ہوا سرخ انار چھابڑی میں پڑا تھا۔ چھت کے ساتھ انگوروں کے بڑے بڑے خوشے لٹک رہے تھے دلشاد کا گلہ کانٹے کی طرح خشک تھا۔ اسکی زبان پر گدلے گدلے' میلے میلے لعاب کی پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ اسکے پیٹ میں ایک عجیب سا بخار سلگ رہا تھا۔ اسکی کمر میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور اسکا سارا بدن ایک دکھتے ہوئے پھوڑے کی طرح چرمر کر رہا تھا۔

دلشاد نے اپنی خشک زبان ہونٹوں پر پھیری۔ اسکی ننھی سی بچی چوہیا کی طرح اسے سینے سے چمٹی ہوئی چس چس دودھ پی رہی تھی۔ کبھی وہ سوچتی تھی کہ شائد وہ رات بھر سوتی ہی رہی اور مغرب کی سہانی منزل مقصود کو پیچھے چھوڑ آئی۔ کبھی اسے خیال آتا کہ شائد اسی اسٹیشن کی فلک بوس عمارت کے پیچھے اسکا رحیم خان اسکے انتظار میں کھڑا ہو یا شائد وہ لوگوں کے ان جمگھٹوں میں کھویا ہوا اسے تلاش کر رہا ہو جو پلیٹ فارموں پر ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔

وہ کوشش کر کے اٹھی' کہ لوگوں کے قریب ہو جائے لیکن اسکے گھٹنے کٹاک سے بج کر رہ گئے۔ اسکی پنڈلیوں میں رعشہ سا آ گیا اور وہ سر تھام کر ٹیلے کے سہارے پھر بیٹھ گئی۔

دو خوش پوش' خوش شکل نوجوان لڑکے ہاتھ میں ہاتھ دیے پلیٹ فارم پر ٹہل رہے تھے۔ ایک سگریٹ پی رہا تھا۔ دوسرے کے پاس سگار تھا جب وہ دلشاد کے سامنے سے گزرتے تو دور تک پیچھے مڑ مڑ کر اسے دیکھتے رہتے۔ رفتہ رفتہ انکے چکر کی طوالت کم ہوتی گئی اور بالآخر وہ دلشاد کے عین سامنے کھڑے ہو گئے۔ دلشاد کا دل زور زور سے پسلیوں سے ٹکرانے لگا۔ بیم و رجا کا ایک عجیب سا تانا بانا اسکے دماغ پر چھا گیا۔ چمکور کی مسجد میں اگر کوئی اسے گھور کر دیکھتا تو وہ بے بسی کے عالم میں اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ کے بیٹھ جاتی تھی۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اگلے لمحے اسے گھورنے والے کے ہاتھ اس کا گوشت نوچ کھسوٹ کر رکھ دیں گے۔ لیکن ریل میں بیٹھ جانے کے بعد اسنے ان خوشگوار توقعات کا سہارا

پکڑ لیا تھا' جو مغرب کے تصور سے اس کے دل و دماغ میں بسی ہوئی تھیں۔ اس لئے وہ سوچنے لگی' کہ شائد یہ خوبصورت جوان وہ مہربان بھائی ہوں' جن کے خون کی کشش انبالہ کیمپ کی عورتوں کو ہر لمحہ اپنی طرف کھینچا کرتی تھی۔ اس خیال سے دلشاد کے دل میں ایک خوشی کی لہر ناچی۔ وہ تو مسکرانا بھی چاہتی تھی۔ لیکن اسکے بدن میں درد کی ٹیسوں کا طوفان سا اٹھا ہوا تھا اسلئے باوجود کوشش کے بھی بناوٹی طور پر بھی مسکرا نہ سکی۔ پھر بھی محبت کا جتنا لوچ اسکا دکھتا ہوا' رستا ہوا جسم اکٹھا کر سکتا تھا' اس نے اپنی آنکھوں میں سمیٹ کر ان نوجوانوں کی طرف بڑے پیار سے دیکھا۔

'انور!' ایک نوجوان سگریٹ کا دھواں دوسرے کے منہ پر چھوڑ کر گرمجوشی سے مسکرایا۔

'رشید' دوسرے نوجوان نے گرمجوشی کا جواب گرمجوشی سے دیا۔

انور! رشید!! دلشاد گویا سرشار ہوگئی۔ یہ دو نام اسکے کانوں میں آب حیات سا ٹپکا گئے۔ مہینوں سے وہ ایسے مانوس نام سننے کے لئے ترس گئی تھی۔ اسکے گاؤں کے انور' رشید' محمود' نسیم' خالد' جاوید تو مدت سے مٹ گئے تھے۔ انکی جگہ اسکے تصور میں اب شمشیر سنگھ' امریک سنگھ' کرتار سنگھ' ترلوک سنگھ' پنجاب سنگھ' سورمکھ سنگھ اور دربار سنگھ کے نام اژدھوں کی طرح لہراتے تھے۔ ان انموں کا زہر اسکی رگ رگ میں خون کی طرح سرائت کر چکا تھا۔ انکی سڑاند اسکے روئیں روئیں میں بسی ہوئی تھی۔ انکا وحشی ابال اسکی ہڈیوں میں درد بن کر رچا ہوا تھا لیکن اب جو اسکے کانوں نے رشید اور انور کے نام سنے' تو اسے یوں محسوس ہوا' جیسے وہ آب کوثر سے نہا رہی ہو۔ جیسے وہ پاک و مصفا پانی اس کے گلے ہوئے' سڑے ہوئے جسم پر گلاب اور کافور کی خوشبوئیں چھڑک رہا ہو..... انکی گری ہوئی گردن میں افتخار کا ابھار آ گیا۔ اس کے مایوس اور غم دیدہ سینے میں امید اور مسرت کی کرنیں پھوٹ اٹھیں اور اس نے ہاتھ کے اشارے سے ان دونوں نوجوانوں کو اپنے قریب بلایا۔

'یہ کیا جگہ ہے بھائی؟' دلشاد نے پوچھا۔

'لاہور ہے۔' انور نے کہا۔

'تم کہاں جاؤ گی۔' رشید نے پوچھا۔

'جہاں قسمت لے جائے'

'باپ رے باپ' انور نے رشید سے سرگوشی کی۔

'بڑی سپورٹ ہے بھائی!' رشید نے انور کو آنکھ ماری۔

'آؤ بہن' تم ہمارے ساتھ چلو۔' دونوں ہم زبان ہو کر بولے۔

جب دلشاد ٹھیلہ کا سہارا لے کر اٹھی تو اسکے بھائیوں کو پہلی بار اپنی ننھی سی بھانجی کی جھلک دکھائی دی۔

'ارے' انور حیرانی سے اچھلا۔

'یہ کیا بلا ہے؟' رشید نے پوچھا۔

'لڑکی ہے جی۔' دلشاد کچھ ہچکچائی' کچھ شرمائی۔

'بڑی چھوٹی سی ہے۔' انور نے جائزہ لیا۔

'ایک ہی دن کی ہے جی۔' دلشاد آخر بھائیوں سے کیا کہے' کیا نہ کہے۔

'آخ تھو' انور کو ابکائی سی آئی۔

'لاحول ولاقوۃ' رشید کا جی متلایا۔

وہ دونوں بھائی قے کرتے کرتے بچے' اور تیز تیز قدم وہاں سے چلے گئے۔ سامنے والے پلیٹ فارم پر ایک خوبصورت عورت بھڑکیلی سی شلوار اور قمیض پہنے جا رہی تھی۔ اسکا دھانی دوپٹہ اسکے سڈول شانوں پر لہرا رہا تھا۔ رشید اور انور نے چھلانگیں مار کر ریل کی پٹڑی کو عبور کیا اور ہاتھوں میں ہاتھ دیے اس خوبصورت عورت کے تعاقب میں چل کھڑے ہوئے۔

دوپہر کے وقت اسٹیشن کی رونق زرا ڈھل گئی۔ دھوپ میں تمازت کا اثر بڑھ گیا اور مہربان سورج کی کرنیں دلشاد کے دکھتے ہوئے جسم کی ٹکور کرنے لگیں۔

ایک انگریز اپنی میم کے ساتھ پلیٹ فارم پر دھوپ سینک رہا تھا ان کا چھوٹا سا لڑکا دلشاد کے قریب اپنے کتے سے کھیل رہا تھا۔ جب اسنے دلشاد کی ننھی سی لڑکی کو دھوپ میں لیٹے ہوئے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے دیکھا' تو اسکی آنکھیں فرط حیرت سے پھیل گئیں اور وہ خوشی سے چیختا ہوا بھاگا اور اپنی ماں کو یہ عجوبہ دکھانے کے لئے گھسیٹ لے آیا۔

'ہاؤ ونڈر فل' ممی' ہاؤ ونڈر فل! بچہ چیخ رہا تھا اور حیرت اور مسرت سے اسکی آنکھیں پھٹی جاتی تھیں۔

دلشاد کی بیٹی ایک پھٹی سی چادر میں لپٹی ہوئی اپنے ننھے ننھے گھونسے تان کر آسمان کو دکھا رہی تھی اور اسکے چھوٹے چھوٹے پاؤں ارض سما کی کونین کو اپنی ٹھوکروں سے دھتکار رہے تھے۔ انگریز کا بچہ اس ننھی سی چیز کو دیکھ دیکھ کر تالیاں بجاتا تھا۔ ناچتا تھا اور ہر لمحہ کوشش کرتا تھا کہ وہ اچک کر اس جاندار کھلونے کو اپنے ہاتھوں میں اٹھا لے۔ اسکی ماں نے اسے ڈانٹا کہ دوسروں کی چیزوں کو ہاتھ نہیں لگایا کرتے۔ لڑکا مچل گیا۔

'ہم تم کو ایسا ہی کھلونا لا دیں گے۔' لڑکے کے باپ نے اسے چمکارا..... 'جھوٹ' لڑکا رو رہا تھا۔

'ہاں' ہاں بچے ہم ضرور تم کو ایسا ہی کھلونا لا دیں گے۔' لڑکے کی ماں نے وعدہ کیا۔

'تم کب مجھے ایسا ہی کھلونا لا دو گے؟ لڑکا بات پکی کرنا چاہتا تھا۔

'بہت جلد' میرے بیٹے' بہت جلد۔' باپ نے اپنی بیوی کے گاؤن کا جائزہ لیا۔ جسکی گولائی پیٹ کے اوپر بہت پھیلی ہوئی تھی۔ بیوی نے شرما کر منہ پھیر لیا۔

'ممی! اس کھلونے کو چاکلیٹ دو!'

'نہیں بیٹے' یہ چاکلیٹ نہیں کھا سکتی۔'

'اچھا تو ممی' اسے ایک عمدہ سا سوٹ دو۔'

'ہاں میرے ڈارلنگ' ہم اسے کپڑا دیں گے۔'

'اور پیسے بھی' میری ممی!'

'ہاں پیسے بھی میرے ڈارلنگ۔'

لڑکا خوشی سے چیخ چیخ کر پھر تالیاں بجانے لگا اور جب اسکا جی اس کھیل سے بھر گیا تو اسکی ماں نے دلشاد کو اونی کپڑے کا ایک ٹکڑا اور پانچ روپے دیے۔ جب وہ جانے لگے' تو دلشاد نے دل ہی دل میں اس بچہ کو دعا دی' جو پہلی بار اسکی زندگی میں رحمت کا فرشتہ بن کر نازل ہوا تھا۔ جب دلشاد کے ہاتھ میں پیسے آ گئے تو دنیا کے ساتھ اسکا رشتہ از سر نو قائم ہو گیا۔ ایک چائے والے نے اسکے پاس آ کر 'گرم چائے' کی ہانک لگائی۔ ایک 'گوشت روٹی' والا بھی اسکے نزدیک اپنا خونچہ لے آیا۔ اور جب دلشاد روٹی کھانے لگی تو ایک کتا بھی زبان نکال کر اسکے سامنے آ بیٹھا۔

قریب ہی ایک بنچ پر دو بزرگ بیٹھے رائے زنی فرما رہے تھے۔ ایک کی داڑھی سفید تھی' دوسرے کی حنائی۔ دونوں کچھ دیر سے انگریز اسکی میم اور بچے کی حرکات پر ناک بھوں چڑھا رہے تھے۔ جب میم نے دلشاد کو اونی کپڑا اور پانچ روپے خیرات دیے' تو ان دونوں بزرگوں کو یہ محسوس ہوا کہ اس فرنگن نے ان داڑھیوں کو پکڑ کر زور سے جھٹک دیا تھا۔

'لاحول ولاقوۃ' ایک حضرت خفا ہوئے۔ 'یہ حرامی اب تک یہ سمجھتے ہیں کہ ہم انہیں کے ٹکڑوں پر پل رہے ہیں۔'

'ارے میاں انکا قصور نہیں۔' دوسرے صاحب نے فیصلہ صادر کیا۔ 'کیوں نہیں اس کم بخت عورت نے ایسی ذلیل خیرات کو نفرت سے ٹھکرا دیا؟'

'اللہ اللہ آزادی تو ملی' لیکن غلامی کا چسکہ نہ گیا۔'

'جائے کیسے میرے بھائی' جائے کیسے؟ جب ایسے آقاؤں کی جوتیوں کے صدقے مفت کی گوشت روٹی ملے تو آزادی کی محنت کا بار کون اٹھائے؟'

'اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی!'

پہلے والے حضرت نے رقت سے الاپا۔

دوسرے حضرت نے بھی آزادی اور خودی کی عظمت میں کچھ مصرعے ارشاد فرمائے۔ جب دلشاد چار آنے کے گوشت' تین آنے کی روٹی اور دو آنے کی چائے سے اپنے دوزخ شکم کو ایندھن دے چکی تو وہ دونوں بزرگ جنبش فرما کر اسکے پاس آئے۔

'اے عورت کیا تم مہاجر ہو۔' ایک نے خشمگیں انداز سے پوچھا' جیسے زمانہ سلف کا قاضی کسی زانیہ عورت سے خطا کر رہا ہو۔

'جی نہیں' میرا نام دلشاد ہے'

'ارے ہوگا' لاحول ولاقوۃ' ہم پوچھتے ہیں تم کہاں سے آئی ہو۔'

'کہاں جاؤ گی اور یہاں پر تمہارا کیا کام ہے؟' دوسرے حضرت نے مہارنی کی۔

اے کاش دلشاد کو معلوم ہوتا کہ اس کی منزل مقصود کا نشان..... کس شاہراہ پر ملے گا۔ اسکے تخیل میں تو مغرب کی ساری کائنات اسکی منزل تھی۔ وہ تو ایک ایسی وسیع برادری میں شامل ہونے والی تھی، جس میں اسے سارے اپنے ہی نظر آتے ہوں۔ لیکن یہاں کی اینٹ اینٹ اس سے پوچھتی تھی کہ تم کون ہو؟ تم کیا ہو، تمہاری جیب میں پیسے ہیں.....؟ تمہارے جسم میں تازگی ہے.....؟

'تم مہاجر ہو۔' ایک بزرگ نے فتویٰ دیا۔ 'تم مہاجر خانے چلی جاؤ'

''آزاد قوم کی بیٹیاں بھیک کے ٹکڑوں پر نہیں پلتیں، ہاں۔'

'تم کوئی بچہ نہیں ہو۔ تمہیں خود شرم آنی چاہیے۔'

دلشاد دیر تک بیٹھی سوچتی رہی کہ شائد وہ بزرگ مہاجر نام کی لڑکی کی تلاش میں تھے۔ جو کوئی گناہ کبیرہ سرزد کر کے گھر سے بھاگ گئی تھی۔ لیکن شام تک بہت سے لوگوں نے اسے ہی پکارا اور سب نے اسے مہاجر خانے میں چلے جانے کی تلقین کی۔

مہاجر خانہ..... مسافر خانہ کے وزن پر۔ ایک دفعہ جب دلشاد اپنے ابا کے ساتھ شہر گئی تھی تو وہ دونوں حاجی موسیٰ کے مسافر خانہ میں ٹھہرے تھے..... مسافر خانے میں چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیاں تھیں ایک بھٹیارن اوپلوں کی آگ پر ماش کی دال پکا رہی تھی جب دلشاد اسکے پاس چٹائی پر کھانا کھانے بیٹھی، تو بی بھٹیارن نے بہت سا گھی پیاز کے ساتھ بھگار کر اسکی دال میں ڈالا اور گرم گرم روٹیوں پر تازہ مکھن رکھ کر کھانے کو دیا۔ رات کر جب ملا علی بخش عشاء کی نماز پڑھنے لگا تو بھٹیارن دلشاد کی چارپائی کے ساتھ اپنی چارپائی لگا کے لیٹ گئی اور دیر تک اسے مزیدار کہانیاں سناتی رہی۔ کبھی سات بیٹوں والے راجہ کا قصہ، کبھی پریوں کی بادشاہ زادی کا افسانہ۔ کبھی اپنے بھٹیارے جیون کی کہانی۔ بھٹیارن کئی دفعہ روئی، کئی دفعہ ہنسی۔ اور آج تک جب دلشاد شہر کی بارونق سڑکوں کا تخیل باندھتی تو اسکے پردۂ خیال پر حاجی موسیٰ کی سرائے کا عکس ابھر آتا اور اس بھٹیارن کی تصویر بھی جو کبھی روتی تھی، کبھی ہنستی تھی، اور کبھی دلشاد کو گرم گرم چپاتیوں پر مکھن کے پیڑے رکھ کر کھانے کو دیتی تھی۔

مہاجر خانہ..... شائد مسافر خانہ کا بگڑا ہوا نام ہو، جیسے گاؤں والے ہسپتال کو ڈاک خانہ کہتے ہیں۔ شائد شہر والے مسافر خانہ کو مہاجر خانہ کہتے ہوں..... لیکن اسکو اپنا نیا نام کچھ زیادہ پسند نہ آیا۔ مہاجر بھی کوئی نام سا نام ہے بھلا؟ دلشاد تو بڑا رسیلا نام تھا۔ اس نام کے ساتھ ملا علی بخش کی یاد وابستہ تھی۔ جس نے قرآن شریف سے فال نکال کر اسے یہ نام دیا تھا۔ اسی ایک نام میں رحیم خان کا فسانہ محبت بھی منظوم تھا۔ وہ دلشاد کے ساتھ آباد، بیداد، صیاد کے قافلے باندھ کر بڑے رس بھرے دوہے گایا کرتا تھا۔

مہاجر خانہ..... جب وہ مہاجر خانے پہنچی تو لاہور کے شانوں پر رات کے گیسو پھیل رہے تھے۔ مہاجر خانے کا افسر ایک چھولداری میں رجسٹر کھولے بیٹھا تھا۔ کچھ دیر بعد دلشاد کی باری آئی۔

'نام' افسر نے طوطے کی طرح رٹا ہوا سوال دہرایا۔

'دلشاد'

'عمر؟'

'بیس سال'

'باپ کا نام؟'

'ملا علی بخش'

'زندہ ہے یا مر گیا؟'

'مارڈالا گیا۔'

'گاؤں؟'

'چمکور'

'ضلع؟'

'انبالہ'

'شادی شدہ؟'

'جی نہیں'

مہاجر خانے کے افسر نے قلم روکا اور خشمگیں نگاہوں سے دلشاد کو گھورا۔ 'یہ لڑکی کس کی ہے؟'

'جی یہ لڑکی میری ہے۔' دلشاد ہکلانے لگی۔ 'میری شادی ہوگئی ہے جی' میں بھول گئی جی۔'

افسر کا قلم مشین کی طرح پھر دوات کی طرف گھوم گیا۔

'سوچ کے بولو' خاوند کا نام؟'

'رحیم خان'

'زندہ ہے یا مر گیا؟'

'جی..... پتہ نہیں۔ خدا کرے زندہ ہو۔ خدا کرے میری عمر بھی اسے لگ جائے جی.....'

مہاجر خانے کا رقبہ کافی وسیع تھا۔ کوئی آٹھ سو فٹ لمبا' پانچ سو فٹ چوڑا۔ ایک کھلا میدان۔ جس کے چاروں طرف کانٹوں والی تار کا احاطہ باندھا ہوا تھا۔ چھت کے لئے آسمان کا لاجوردی سائبان تھا روشنی کے لئے ماہتاب کی قندیل اور تاروں کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ تھے۔ ایک کونے میں باورچی خانہ تھا۔ زمین میں کھودے ہوئے عمیق چولہوں پر دال اور گوشت کی بڑی بڑی دیگیں پک رہی تھیں۔ رات کے اندھیرے میں چولہوں کی آگ دیگوں کے گرداگرد یوں بھڑکتی تھی' جیسے چتاؤں کے شعلوں میں دیوتاؤں کے لاشے جل رہے ہوں۔ آگ کی روشنی میں مہاجر خانے کا وسیع میدان نکھر آیا تھا' جس طرح شفق شام میں نتھرے ہوئے ابر پاروں کی سرخی کسی قبرستان پر غبار کی طرح چھا جائے۔ ساری فضا میں ایک غمناک سا ٹھہراؤ تھا۔ ایک ہلکا سا' ایک غیر محسوس سا ارتعاش جس میں لاکھوں سینوں کے کچلے ہوئے ارمانوں

اورٹوٹے ہوئے دلوں کی معصوم دھڑکنیں کپکپا رہی تھیں، تھرتھرا رہی تھیں، اور ہر لمحہ یہ ڈر لگتا تھا کہ کسی وقت سکون وجمود کا یہ مصنوعی طلسم یکا یک ٹوٹ جائے گا۔ اور ایک زبردست طوفان، ایک بے پناہ زلزلہ، ایک ہولناک چنگھاڑ زمین وآسمان کے نظام کو درہم برہم کر کے رکھ دے گی۔

دلشاد اپنی بچی کو سینے سے لگائے قدم پھونک پھونک کر چلتی تھی۔ جس طرح قبرستان میں بچا بچا کر پاؤں رکھا جاتا ہے کہ کہیں کسی مقدس مزار کو ٹھوکر نہ لگ جائے۔ کچھ مہاجروں نے بانسوں پر چادریں تان تان کر چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں بنالی ہیں کچھ مہاجر کچی قبروں کی طرح یوں ہی آسمان تلے بیٹھے ہوئے تھے..... آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے..... کسی کے پاس چادر تھی، کسی کے پاس کمبل، کسی کے پاس لحاف، دلشاد کے پاس نہ چادر تھی، نہ کمبل تھا، نہ لحاف۔ وہ خود ایک چیتھڑا تھی۔ ایک بوسیدہ سا، ایک فرسودہ سا ٹکڑا، جو اسکے لباس دوشیزگی کی یاد میں باقی رہ گیا تھا..... مہاجر خانے میں ایسے سینکڑوں چیتھڑے بکھرے پڑے تھے۔ سب کے دل میں امید کی لو لگی ہوئی تھی کہ اب وہ اپنی پیاری سرزمین پر آگئے ہیں۔ اب اس ارض مقدس کی خاک انکے گلتے ہوئے ناسوروں پر مرہم بن کر لگ جائے گی۔ اب یہاں کا متبرک پانی انکے رستے ہوئے زخموں کو دھو ڈالے گا۔ اب یہاں کے سورج اور چاند کی تنویریں انکے چاک دامنوں کو رفو کر دیں گی۔

ایک خالی سی جگہ دیکھ کر دلشاد ٹھہر گئی۔ کچھ دور آگے ایک کہنہ سال ضعیف آدمی ڈیرہ ڈالے بیٹھا تھا۔ اسکے ساتھ دو بچے تھے، ایک آٹھ دس سال کا لڑکا محمود، ایک گیارہ بارہ سال کی لڑکی زبیدہ، وہ تینوں ایک مٹی کے پیالے پر جھکے ہوئے روٹی کھا رہے تھے۔ محمود پوچھتا تھا کہ دادا آج سالن میں بوٹی کیوں نہیں؟ زبیدہ اپنے دادا کی وکالت کرتی تھی اور کہتی تھی کہ ہر روز گوشت نہیں کھایا کرتے، اس سے پیٹ خراب ہو جاتا ہے، دانتوں کو کیڑا لگ جاتا ہے..... لیکن محمود مچل رہا تھا۔ دادا اسے چمکارتا تھا۔ زبیدہ اسے ڈانٹتی تھی۔ 'کیا میں تجھے اپنی بوٹیاں کاٹ کر دے دوں۔' وہ چھوٹی سی بہن اپنے چھوٹے سے بھائی کو بزرگوں کی طرح ڈانٹتی تھی اور دیکھنے والے کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ اس مختصر سے خاندان کا نگہبان دادا نہیں، زبیدہ ہے۔ اس لڑکی کا شعور اس قدر حساس اور بیدار تھا کہ وہ بیک وقت ایک ننھی سی بہن، ایک ننھی سی بیٹی، ایک ننھی سی ماں کے فرائض انجام دے رہی تھی۔

''یہیں بیٹھ جاؤ، بیٹی۔ تمہارے ساتھ کوئی اور ہے؟' بوڑھے دادا نے دلشاد سے پوچھا۔

'جی نہیں..... میرے ساتھ کوئی اور نہیں ہے۔'

'جاؤ روٹی لے آؤ باورچی خانے سے۔ تمہارے پاس کوئی پیالہ ہے؟'

'جی نہیں۔ میرے پاس کوئی برتن نہیں۔'

دادا نے اپنا ایک خالی پیالہ اسے دے دیا۔

'پالا بھی بہت ہے بیٹی۔ تمہارے پاس کوئی بستر ہے؟'

'جی نہیں۔ میرے پاس کوئی بستر بھی نہیں۔'

دادا نے اس ویران ہستی پر ہمدردی کی ایک بھرپور نگاہ ڈالی۔ وہ بھی بالکل اسی حالت میں یہاں آیا تھا۔

'باورچی خانے کے پاس کپڑوں کا دفتر ہے۔ کمبل مانگ لینا وہاں سے۔' پھر دادا نے ستاروں کو دیکھ کر وقت کا حساب لگایا۔ 'نو بج رہے

ہیں۔شائد سٹور بابو جاگتا ہو۔'

باورچی نے دلشاد کو دو روٹیاں اور پیالہ بھر دال دے دی۔ کپڑوں کے دفتر میں ایک مدہم سی لالٹین جل رہی تھی۔ خیمے میں رضائیوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔سرخ سرخ' بھورے بھورے' کالے کالے کمبلوں کی تہوں پر تہیں جمی ہوئی تھیں۔ایک کونے میں گرم کپڑوں کے ڈھیر تھے۔اونی سوئٹر پٹو کے کوٹ' گرم چادریں.....سٹور بابو سرخ وسفید چھینٹ کی رضائی اوڑھے چارپائی پر لیٹا ہوا اقبال کا شکوہ گا رہا تھا۔

رحمتیں ہیں تیری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر

جب اس نے دلشاد کو خیمے کے دروازے میں کھڑا ہوا پایا تو اسکے ترنم کی لے سست پڑ گئی اور اسنے نہائت خشمگیں انداز سے دلشاد کو گھورا۔

'دفتر بند ہے جی اس وقت۔صبح آٹھ بجے آنا۔'

'ہمارے پاس کوئی کپڑا نہیں ہے۔ہم پالے سے مر جائیں گے۔'

'کوئی نہیں مرتے۔صبح آٹھ بجے آنا'ہاں۔دفتر بند ہے اس وقت۔'

دلشاد نے ایک بار پھر التجا کی۔سٹور بابو جھنجلا گیا۔

'میں کہتا ہوں چلی جاؤ سیدھی طرح'میں بھی آخر انسان ہوں۔مشین نہیں ہوں'ہاں صبح آٹھ بجے آنا۔'اور پھر وہ اپنے نرم وگرم لحاف میں سکڑ کر شکوہ گانے لگا.....

آئے عشاق گئے وعدہ فردا لے کر
اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر

جوں جوں رات بھیگتی گئی'سردی میں اضافہ ہوتا گیا اور رفتہ رفتہ یوں محسوس ہونے لگا جیسے ساری کائنات یخ بستہ ہوگئی ہو۔سرد ہوا کے جھونکے تیر ونشتر کی طرح بدن میں لگتے تھے اور زمین کی نمی زہر آلود کانٹوں کی طرح جسم میں چبھتی تھی۔دادا کے پاس ایک کمبل تھا۔اسنے اسے آدھا نیچے بچھا کر محمود اور زبیدہ کو سلا دیا تھا اور آدھا کمبل انکے اوپر ڈال دیا تھا۔وہ خود ایک پتلی سی چادر اوڑھے زمین پر لیٹا ہوا کروٹیں بدل رہا تھا۔دلشاد کے دانت کٹا کٹ بج رہے تھے۔وہ اپنی بیٹی کو اونی کپڑے میں لپیٹ کر اپنے سینے سے چمٹائے بیٹھی تھی۔کبھی وہ لیٹ جاتی تھی۔کبھی اٹھ بیٹھتی تھی.....کبھی کھڑی ہو کر گھومنے لگتی تھی۔لیکن ہر کروٹ'ہر پہلو سردی کا اثر سانپ کے زہر کی طرح اسکی ہڈیوں میں سرسراتا ہوا بڑھ رہا تھا اور اسے ڈر لگتا تھا کہ شائد اگلے لمحے وہ برف کے ٹکڑے کی طرح جم کر رہ جائے گی۔

کچھ دور آگے ایک جوان عورت اپنے جسم کی گرمی ہر ممکن طریقے سے اپنی چار سالہ لڑکی کے جسم میں منتقل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔انکے پاس بھی نہ کمبل تھا'نہ لحاف'نہ چادر لڑکی کا سانس اکھڑا اکھڑا سا تھا۔اسکے سینے میں گھنٹیاں بج رہی تھیں۔جیسے بہت دور افق لکیر سے پرے'ازمنوں کا ایک کارواں کسی جنت گم گشتہ کی تلاش میں چلا جا رہا ہو'چلا جا رہا ہو'رواں دواں'' رواں دواں.....جیسے جیسے سردی بڑھتی گئی' لڑکی کے سینے کی گھنٹیاں تیز تر ہوتی گئیں۔اسکے سانس میں ایک زبردست تناؤ آگیا جیسے زندگی اور موت کے فرشتے اسکے سانس کی لڑی

تھام کر آپس میں رسہ کشی کر رہے ہوں۔

اسکی ماں گھبرا گئی۔ بے بس ہوگئی' لاچار ہوگئی۔ اسنے کھڑے ہوکر گردوپیش کا جائزہ لیا۔ زمین پر اندھیرے کا سیاہ کفن چڑھا ہوا تھا۔ کبھی کبھی چاند بھی اپنے لحافوں کی اوٹ سے جھانک کر دیکھ لیتا تھا۔ چاروں طرف سکوت پا کر وہ عورت سمٹ کر بیٹھ گئی۔ اسنے چوروں کی طرح دزیدہ نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا اور ہولے ہولے جھجکتے ہوئے' شرماتے ہوئے اسنے اپنے کپڑے کھول کر اپنی ٹھٹھری ہوئی بیمار بچی کو ان میں لپیٹ لیا۔ اندھیرے میں ایک بجلی سی لہرائی اور اس جوان عورت کا برہنہ جسم کائنات کے ذرے ذرے کو للکارنے لگا کہ دیکھو دیکھو یہ لاجواب ساعت بیت نہ جائے۔ تم نے ارض وسما کے بہت سے راز دیکھے ہوں گے۔ لیکن تم اس ماں کے برہنہ جسم کو نہ بھول سکو گے جس کے کپڑوں میں اسکی مرتی ہوئی بیٹی لپٹی پڑی ہو اور بڑا سخت پالا پڑ رہا ہو اور سٹور بابو رضائی میں لپٹا ہوا 'شکوہ' گا رہا ہو اور..... عورت کا عریاں جسم ایک غلیظ گالی بن کر چاروں طرف چھا گیا۔ آسمان پر جو تارے ٹمٹما رہے تھے آنکھیں موند کر بادلوں کی اوٹ میں چھپ گئے۔ چاند بھی اپنے لحافوں کیے بیچ سے جھانک کر یہ نظارہ دیکھنے کی تاب نہ لا سکا۔ ایک گھنگھور گھٹا جو آسمان پر بے پروائی سے بکھری ہوئی تھی' سمٹ سمٹا کر اکھٹی ہوگئی۔ اور بادلوں کی پلکوں سے موٹے موٹے آنسو گرنے لگے۔

ٹپ ٹپ ٹپ..... ٹپ ٹپ ٹپ..... بوندیں برس رہی تھیں۔ ٹھٹھری ہوئی ہوا کی سن سن سسکیوں کی طرح آہیں بھر رہی تھیں۔ مہاجر خانے کے میدان میں زندگی کی ایک کمزور سی لہر جاگی۔ کچھ بچے روئے' کچھ عورتوں نے شور مچایا' کچھ مردوں نے ڈانٹ بتائی اور پھر ایک سناٹا چھا گیا۔

مینہ کی بوندیں دلشاد کے بدن میں بندوق کے چھروں کی طرح پیوست ہو رہی تھیں۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے امریک سنگھ' ترلوک سنگھ' پنجاب سنگھ' سورمکھ سنگھ' دربار سنگھ کی کرپانیں اس کے جسم کو چھید رہی ہیں۔ بارش کا پانی فلالین کے گرم کپڑے میں بھی نفوذ کرتا گیا اور اس میں لپٹی ہوئی ننھی سی جان سردی سے کپکپانے لگی۔ دلشاد نے سوچا کہ اگر وہ دادا سے پوچھ کر اپنی لڑکی کو محمود اور زبیدہ کے کمبل میں لٹا دے تو شائد اس غریب کی جان کو کچھ سہارا مل جائے۔ اس نے دادا کے گھٹنے کو ہلایا' بانہوں سے ہلایا۔ گردن سے جھنجھوڑا' ہاتھ کھینچے' لیکن دادا کا خاکی جسم سردی اور گرمی کے احساس سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ زندگی کا خون اسکی رگوں میں جم کے رک گیا تھا۔ اور اسکی ہڈیاں سردی سے اکڑ کر لوہے کی سلاخوں کی طرح تن گئی تھیں۔

جب صبح صادق کی پو پھٹی تو مہاجر خانے کے میدان میں ایک مرمریں مجسمہ چاندی کی طرح جھلملایا۔ یہ اس جوان عورت کا برہنہ جسم تھا۔ جس نے اپنے کپڑوں میں اپنی مرتی بچی کو لپیٹ لیا تھا۔ اسکے بے جان سینے سے اس کی بچی کی لاش یوں چمٹی ہوئی تھی جیسے ابھی ابھی دودھ پینے لگی ہو۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی بڑے فنکار نے مرمر کو تراش کر یہ خوبصورت بت بنائے ہیں۔ عورت کے کسے ہوئے دودھیا بدن پر بارش کے قطرے موتیوں کی طرح جگمگا رہے تھے۔ اسکی گھنی زلفیں کالے ناگوں کی طرح بپھری پڑی تھیں

اس کی نیم باز آنکھوں میں پانی کی ایک تہ سی جمی ہوئی تھی' جیسے اسکے خون کے ساتھ ساتھ اسکے آنسو بھی منجمد ہو کر رہ گئے ہوں۔

مہاجر خانے کے کچھ مہتر کمبلوں کا پلندہ اٹھا کر لے آئے۔ ایک کمبل انہوں نے دادا پر ڈال دیا۔ دوسرا عورت کے کسے ہوئے ننگے بدن پر'

تیسرا اس بچی پر چوتھا..... اور اسی طرح وہ میدان میں بکھری ہوئی لاشوں پر نرم نرم کمبلوں کے کفن ڈالتے گئے جو لوگ زندہ تھے وہ حسرت بھری نظروں سے اپنے مردہ ساتھیوں کو دیکھتے تھے اور رشک کرتے تھے کہ اگر موت کے تصور میں ایک ان دیکھی ان جانی ان سمجھی حقیقت کا خوف نہ ہوتا۔ تو وہ سب برضا و رغبت وہیں مر جاتے تا کہ مہاجر خانے کے مہتران پر بھی اونی کمبل ڈالتے جائیں۔ اور انکے کپکپاتے ہوئے گوشت اور ٹھٹھرتی ہوئی ہڈیوں کو ذرا سا سکون' ذرا سی گرمی' ذرا سا آرام میسر آئے۔

محمود مچل رہا تھا کہ دادا ابا کو وہ لوگ اٹھا کر کہاں لے گئے ہیں؟ زبیدہ اسے سمجھاتی تھی کہ دادا' ابا اور امی کو بلانے گئے ہیں..... وہ کب آئیں گے؟..... وہ بہت جلد آجائیں گے' میرے محمود' وہ تو بس آتے ہی ہوں گے۔ ابا اور امی کہاں گئے ہیں؟ وہ تھوڑی دیر کے لیے اللہ میاں سے ملنے گئے ہیں۔ وہ اسکے دربار سے تمہارے لئے عمدہ عمدہ کھلونے لائیں گے۔ شیشے کا لٹو' ربڑ کی گیند' چابی والی موٹر' نئے بوٹ' تلے دار ٹوپی..... محمود کا تخیل طرح طرح کے سوال ایجاد کرتا تھا۔ زبیدہ طرح طرح کے جواب گھڑ کے اسے ٹالتی تھی اور جب کبھی محمود ادھر ادھر کھیل میں لگ جاتا تو وہ نظر بچا کر منہ چھپا کر اپنے دل کا غبار نکال لیتی تھی۔

مہاجر خانے کی مشین بائسکوپ کی طرح چل رہی تھی۔ صبح سے شام تک اسکے پردے پر بھانت بھانت کے سین آتے تھے اور نکل جاتے تھے۔

بازیچہء اطفال ہے دنیا میرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا میرے آگے

بڑے بڑے دبدبے والے رئیس اور نواب آتے تھے۔ اونچی اونچی کرسیوں والے حکام آتے تھے۔ سرسراتے ہوئے ریشم اور کمخواب میں ملبوس کلیوں کی طرح کھلے ہوئے حسن میں سرشار گلاب اور چنبیلی کے عطر میں مہکی ہوئی بیگمات آتی تھیں وہ سب بچوں کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرتے تھے۔ عورتوں کے پاس کھڑے ہو کر انکی اشک شوئی کرتے تھے۔ بوڑھوں اور جوانوں کی پیٹھ ٹھونک کر ان کی ٹوٹی ہوئی کمر کو سہارا دیتے تھے اور پھر سبکسار موٹریں انہیں مہاجر خانے سے واپس لے جاتی تھیں۔ کوئی مٹھائی لاتا تھا' کوئی کپڑے بانٹتا تھا' کوئی پلاؤ اور قورمے کی دیگیں تقسیم کرتا تھا اور جب کوئی اس کار خیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تو اسکے چہرے پر فخر و مسرت کی سرخی پھیل جاتی اور وہ دل ہی دل میں اپنے رحمان اور رحیم کا شکریہ ادا کرتا کہ اس نے اپنی قدرت کاملہ سے ایسے سامان پیدا کر دیئے جن کے طفیل اس ناچیز کو بھی مقدور بھر خیرات کرنے کا موقع نصیب ہوا..... دلشاد سوچتی تھی کہ جب کوئی جوان محمود اور زبیدہ کا قصہ سنے گا تو سٹور بابو کو کان سے پکڑ کر گولی سے اڑا دے گا کہ اس نے اس کڑاکے کی سردی میں بھی دادا کو صرف ایک ہی کمبل دیا۔ وہ ڈرتی تھی کہ جب کوئی دبدبے والے طنطنے والے بلند اقبال لوگ اس کی اپنی رام کہانی سنیں گے تو ان کا خون کھول اٹھے گا۔ انکی غیرت کو شدید چوٹ لگے گی۔ اور وہ اپنی بندوقیں اٹھا کر امریک سنگھ' ترلوک سنگھ' کرتار سنگھ' سوہ' دربار سنگھ کی تلاش میں چل نکلیں گے..... لیکن سننے والے سنتے گئے' سنانے والے سناتے گئے۔ دن میں مٹھائی اور پلاؤ بنٹتا گیا رات کو زمستانی ہوا کی شمشیر اپنے وار کرتی گئی اور مہاجر خانہ کا بائسکوپ بدستور چلتا گیا۔ ایک سین کے بعد دوسرا سین' دوسرے سین کے بعد تیسرا سین..... نہ آغاز نہ انجام' ایک مسلسل اور پیچیدہ نظام توہم کہ جس میں انسان' انسان کا رازق بننے کے لئے بیقرار ہو' بے چین ہو اور

اس بازی میں دوسروں پر سبقت لے جانے کے لئے ہر قسم کا داؤ ہر قسم کا پیچ کھیلنے کے لئے تلا ہوا ہو۔

ایک صاحب بڑے مخیّر تھے۔ بدن پر خوشنما سوٹ، سر پر ترچھی ٹوپی آنکھوں پر سونے کے فریم والی عینک، اگلے دانتوں میں سنہری کیلیں، منہ میں پائپ، انگلیوں میں لعل اور یاقوت کی بیش بہا انگوٹھیاں..... وہ گھنٹوں مہاجر خانوں میں گھومتے تھے۔ ایک ایک کی داستان سنتے تھے۔ کسی کو پیسے دیتے تھے۔ کسی کو مٹھائی کی گولیاں۔ کسی کو چاکلیٹ..... دلشاد پر بھی انکی خاص نظر عنائت تھی۔ ایک روز وہ اسکی بچی کے لئے سرخ اون کا دیدہ زیب سوئٹر لائے۔ دوسرے دن انہوں نے رحیم خان کی تلاش کرنے کا وعدہ فرمایا اور کچھ دنوں کے بعد وہ دلشاد کے لئے ایک جانفزا عید کا پیغام لے کر آئے کہ رحیم خان کا پتہ مل گیا ہے۔ بچارہ بے حد کمزور ہے۔ چلنے پھرنے سے معذور، لیکن دلشاد کی یاد کے سہارے وہ ابھی تک بار زیست اٹھائے بیٹھا ہے۔ دلشاد کی نظر میں دنیا گلنار ہوگئی۔ مہاجر خانے کی زمین پر پھول ہی پھول اگ آئے۔ اسکے بدن میں سلگنے والا زہر کافور کی طرح مشکبار ہو گیا اور وہ اپنے دھڑکتے ہوئے سینے میں ارمانوں کا بے پناہ ہجوم چھپائے مسٹر مصطفیٰ خاں سیمابی کی موٹر میں آ بیٹھی۔ کار فراٹے بھرتی جا رہی تھی۔ لاہور کی سڑکیں رنگین سانپوں کی طرح لہرا لہرا کر گزر رہی تھیں۔ یہ باغ جناح ہے، یہ گلستان فاطمہ کی چار دیواری ہے۔ یہ ملکہ معظّمہ کا بت ہے۔ یہ مال روڈ کے رنگین ریسٹوران ہیں۔ یہ نیلا گنبد چوک ہے۔ اس گلی میں انارکلی کا مقبرہ ہے۔ یہ گرجا ہے، وہ مسجد ہے..... یہ مصطفیٰ خاں سیمابی کا مکلّف بنگلہ ہے۔ نوکروں کے کمرے میں گراموفون بج رہا ہے۔

آج کر لے جی بھر کے سنگھار، تو ہے جانا ہے

آج کر لے جی بھر کے سنگھار،

دلشاد کا دل دھک دھک بج رہا تھا۔ اس دھک دھک میں ایک انوکھے سرور کا ترنم تھا۔ وہ برآمدے میں بیٹھے بیٹھے سوچ رہی تھی کہ شائد اس زمین پر رحیم خان کے قدم پڑے ہوں۔ شائد اس بنگلہ کی ہوا میں اس کی دلاویز سانس بسی ہوئی ہو..... دلشاد کی نظر عقیدت میں بنگلے کی زمین کا ذرہ ذرہ مکہ اور مدینہ کی خاک بن گیا۔ بنگلہ کی اینٹ اینٹ پر مسجدوں کے مقدس مینارے تعمیر ہو گئے..... ایک نوکر نے اسے ایک پلیٹ میں پلاؤ، ایک میں پالک اور گوشت، ایک میں مٹر اور قیمہ، ایک میں کیوڑے میں لگائی ہوئی فرنی لا کر دی۔ معلوم نہیں وہ کیا کھا گئی اور کب کھا گئی..... وہ دنیا اور مافیہا سے بے خبر تھی۔ اسکی روح اپنے رحیم خان کے استقبال کے لئے سراپا انتظار بنی ہوئی تھی لیکن اسکے جسم کو ابھی تک کتغ چچوڑ رہے تھے..... مصطفیٰ خاں سیمابی ڈریسنگ گاؤن پہنے اسکے سامنے بھوکے گدھ کی طرح منڈلا رہا تھا۔ میز پر اسکاچ وسکی کی بوتل جگمگا رہی تھی۔ وہ اپنی بانہیں پھیلا پھیلا کر کہتا، کہ میری جان، آ کر میرے سینے سے لگ جاؤ۔ تم بڑی مظلوم ہو..... تم بڑی غریب ہو لیکن میں ایک امیر انسان ہوں میں کچھ روز کے لئے تمہیں ملکہ بنا کر رکھوں گا۔ تمہارا رحیم خان معلوم نہیں کہاں کھو گیا۔ شائد وہ کسی ویرانے میں مرا پڑا ہو۔ لیکن تم اس فرضی ہستی کی یاد میں اپنی جوانی نہ گنواؤ! میری جان آؤ۔ میرے سینے سے لگ جاؤ۔ اب تم اپنے آزاد وطن میں آ گئی ہو..... اب تمہیں کسی بات کا ڈر نہیں۔ یہ ہمارا وطن ہے..... یہ ہمارا آزاد وطن ہے۔ پاکستان زندہ باد! پاکستان پائندہ باد!!..... دلشاد کے گلے میں ملا علی بخش کی تسبیح لٹک رہی تھی۔ جب مصطفیٰ خاں سیمابی کی زبان لپک لپک کر تسبیح کے دانوں کو چومتی تو دلشاد کو یہ محسوس ہوتا کہ ایک مسلمان بھائی سنگ اسود کو بوسہ دے رہا ہے.....'

دو چار دن میں جب مصطفیٰ خاں سیمابی نے اپنے حج کے ارکان پورے کر لئے تو دلشاد پھر مہاجر خانے واپس آ گئی۔ ننھا محمود شیشے کا لٹو چلا رہا تھا۔ اس نے تتلا تتلا کر تالیاں بجا بجا کر دلشاد کو سمجھایا کہ ذبیدہ باجی بھی موٹر میں بیٹھ کر دادا میاں کے پاس گئی تھی..... دادا میاں نے یہ شیشے کا لٹو بھیجا ہے۔ یہ ربڑ کی گیند، یہ رنگ دار مٹھائی، آج پھر وہ موٹر میں بیٹھ کر دادا میاں کے پاس گئی ہے۔ موٹر پوں پوں کرتی جا رہی ہے۔ اب وہ پھر دادا میاں سے پیسے لائے گی۔ نئے نئے بوٹ لائے گی..... تلے دار ٹوپی لائے گی.....!

لاہور، لاہور نہ تھا، مدینہ تھا۔ لاہور والے، لاہور والے نہ تھے۔ انصار تھے..... نہیں وہ تو شائد انصار مدینہ سے بھی کچھ افضل تھے۔ یہاں ہر دلشاد کے لئے ہر روز ایک نیا رحیم خان پیدا ہو جاتا تھا..... ذبیدہ کے لئے ہر روز ایک نیا دادا جنم لیتا تھا۔ بیٹیوں کے لئے نئے نئے باپ تھے..... بہنوں کے لئے نئے نئے بھائی..... جسم کا رشتہ جسم سے ملتا تھا، خون کا رشتہ خون سے.....'

کراچی

دلشاد نے کھڑکی سے منہ نکال کر دیکھا۔صدر کے اسٹیشن پر گہما گہمی تھی۔ریفیوجی سپیشل کی مخلوق گاڑی سے نکل نکل کر پلیٹ فارم پر جمع ہو رہی تھی۔سارا اسٹیشن کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔لیکن دیکھتے ہی دیکھتے بھیڑ بادلوں کی طرح چھٹ گئی۔پلیٹ فارم پر کچھ قلی' کچھ باہر جانے والے مسافر اور کچھ ٹکٹ چیکر باقی رہ گئے۔آن کی آن میں ریفیوجیوں کا جم غفیر بے مایہ قطروں کی طرح کراچی کے محیط بے کراں میں غرق ہو گیا' جیسے سمندر کی تیز و تند لہر ساحل کے خس وخاشاک کو اپنے تموج میں بہالے جائے یا جیسے جیسے سورج کی کرنیں شبنم کے موتیوں کو اپنے دامن میں چھپالیں یا جیسے شراب کا نشہ دل کے گوشے میں لرزندہ اندیشوں کو اپنے خمار کی آغوش میں سلا دے یا جیسے کسی گلتی ہوئی' سڑتی ہوئی لاش کا تعفن گلاب اور موتیے کی شمیم کو اپنے اندر جزب کر لے'

منٹورا آئی لینڈ تیز تیز قمقموں کی روشنی میں جگمگ کر رہا ہے.....کلفٹن بیچ چودھویں رات کی چاندنی میں نہایا ہوا ہے۔سمندر کی لہریں ساحل کو چھیڑ چھیڑ کر ایک مدہوش سا رباب بجا رہی ہیں۔لہروں کا پانی ریتیلے ٹیلوں سے ٹکرا کر فضا میں نقرئی فواروں کی طرح جھلملا رہا ہے۔ہوا میں ایک نازک سی خنکی ایک نرم سی ملائمت ہے۔زندگی کی ایک میٹھی سی تڑپ بیچ پر مخمور سانپوں کی طرح لہرا رہی ہے۔

چار جوان وسکی کے جام بھر کر سوڈا املا رہے ہیں۔'ہائے ہائے دلی۔'ایک نے سینے پر ہاتھ مار کے آہ بھری۔

'سواد رومتہ الکبریٰ میں دلی یاد آتی ہے۔ہائے ری دلی' دوسرے نے واویلا کیا۔

کون جائے ذوق یہ دلی کی گلیاں چھوڑ کر

ہائے دلی' تیری خاک پاک کی کشش

تیسرا رانوں پر تھپڑ مار مار کے ماتم کرنے لگا۔

چوتھا جوان سنجیدہ رہا۔وہ وسکی کا جام ہونٹوں سے چپکائے مراقبے میں گیا ہوا تھا۔جب اسکے ساتھیوں نے ذرا زور شور سے دلی کی نوحہ خوانی شروع کی' تو وہ چونکا.....'ایں؟ یہ تو وہی سالی کراچی رہی۔واللہ خواب تھا جو کچھ دیکھا جو سنا افسانہ تھا' کیا دیکھتا ہوں کہ چاوڑی بازار میں چہل پہل ہے۔بی چاند کا بالا خانہ ہے اور وہ ساقی مہوش اپنی حنائی انگلیوں میں ساغر اٹھائے آ رہا ہے' لا رہا ہے' آ رہا ہے' لا رہا ہے.....'

ہائے ہائے دلی!ہائے ہائے دلی!ہائے بی چاند جان' وائے بی چاند جان.....وہ چاروں ایک فصیح و بلیغ مرثیے کی دھن میں کھو گئے اور ٹھنڈی ریت پر لوٹ لوٹ کر اپنی جنت گم کردہ کا ماتم کرنے لگے۔

کچھ دور پرے ایک مقطع اور متشرع بزرگ پان چبا رہے تھے۔

انکے آگے چند عقیدت مند دوزانو بیٹھے تھے۔

'دلی گئی' دلی والے گئے' سب کچھ گیا لیکن کچھ نہ گیا۔'

'پان لاؤ' بزرگ نے فرمایا۔

انکی خدمت میں پان پیش کیا گیا۔

'تمباکوتو اچھا ہے بھئی'..... بزرگ نے رائے دی۔ 'کہاں سے لائے؟'

کسی نے عرض کیا'۲۹ روپے سیر ہے' لکھنو سے منگوایا تھا۔

'ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ دلی گئی۔'بزرگ نے اپنی ٹوٹی ہوئی تان کو از سر نو پکڑا۔'دلی والے گئے' کیوں؟ جانتے ہو بھلا کیوں؟'

عقیدت مند سوچنے لگے کہ کیوں؟ انکے چہروں پر کیوں کی سوالیہ علامت ٹھپہ بن کر لگ گئی۔

بزرگ نے خود ہی جواب دیا۔'وہ لال قلعہ۔وہ جامع مسجد'وہ قطب مینار'وہ قبریں جن میں بزرگوں کی خاک دو بول دعا سننے کے لئے ترس رہی ہیں۔غالب کا مزار'شیخ المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء کا مرقد نور..... سب چلے گئے۔سب ہاتھوں سے نکل گئے۔تم کہو گے اپنے نصیب'میں کہتا ہوں اپنے اعمال'ہمارے اپنے ناگفتہ بے اعمال'میں تم کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے؟..... پان لاؤ'

پان حاضر کیا گیا۔

'میں تم کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے

شمشیر وسناں اول طاؤس ورباب آخر'

'دھت تیرے کی۔'وسکی والی پارٹی کا ایک جوان اپنے ساتھی پر گرج رہا تھا۔'چاند جان میری تھی'وہ مجھ پر عاشق تھی۔وہ تیرے منہ پر تھوکتی بھی نہ تھی..... ہاں.....'

دوسرا جوان سوڈے کی بوتلیں اور خالی گلاس جمع کر کے ایک عملی سا جواب دینے کی تیاری کر رہا تھا۔

ان کے باقی دو ساتھی ایک دوسرے کے سر پر الٹا کھڑے ہونے کی مشق فرما رہے تھے۔ایک پارسن لڑکی ان کی حرکات پر قہقہے لگا کر فضا میں ایک لذیذ سا ترنم'ایک پیارا سا ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔اسنے نہانے کا رنگین لباس پہنا ہوا تھا۔اس بیدنگ کاسٹیوم میں اسکا چھریرا بدن قوس کی طرح تنا ہوا تھا..... بزرگ فرما رہے تھے..... پان لاؤ۔

چیف کورٹ اور اسمبلی ہال کے درمیان مہاتما گاندھی کا بت پہرے پہ چوکس کھڑا ہے کہ کہیں انصاف اور سیاست ایک دوسرے کے قریب نہ آنے پائیں۔دو سائیکل سوار ٹھہر کر اسکا جائزہ لینے لگے۔ایک نے اس کی لاٹھی چھیننے کی کوشش کی'دوسرے نے اسکی عینک کو اڑانا چاہا۔جب وہ دونوں اس کوشش میں ناکام ہوئے تو ایک نے اپنی رومی ٹوپی اتار کر بت کے سر پر رکھ دی اور وہ خوش خوش وہاں سے چل دیے کہ انہوں نے چپکے چپکے اس بت کو مسلمان کر لیا ہے۔

ایک ہندو خاندان ہجرت کر رہا ہے۔انکی خوشنما کوٹھی کے سامنے چار اونٹ گاڑیاں سامان سے لدی کھڑی ہیں۔لوہے کے ٹرنک'چمڑے کے سوٹ کیس'لکڑی کی پیٹیاں..... سامان میں ایک طوطے کا پنجرہ بھی ہے۔طوطا مٹر کی پھلیاں کھا رہا ہے۔جب کوئی اسکے پاس سے گزرتا ہے تو وہ نیم باز آنکھوں سے اسکی طرف یوں دیکھتا ہے گویا کہہ رہا ہو کہ لو سالو! میں بھی چلا..... اب میں دیکھوں گا تم اپنا پاکستان کیسے بناتے ہو.....؟

قصر بہ ہوٹل کی رقص گاہ میں آرکسٹرا بج رہا ہے ہوٹل کے مینیجر نے اسٹیج پر آ کر اعلان کیا کہ آج رات کی نصف آمدنی قائد اعظم ریلیف فنڈ میں

دی جائے گی' لوگوں نے گرمجوشی سے تالیاں بجائیں۔

'میرا جی کراچی سے اکتا گیا ہے۔' ایک دیدہ زیب بیگم نے شیری کا گلاس لب لعلین سے لگا کر کہا۔ 'چلو ڈیئر کچھ روز کے لئے بمبئی گھوم آئیں۔' اسکا ساتھی شیمپین پی رہا تھا۔ 'اب تو بمبئی بھی مرحوم ہوگئی بیگم..... سالی کانگریس اس پیرس صغریٰ کو راہب خانہ بنانے پر تلی ہوئی ہے' نہ وہسکی' نہ شیری' نہ جن نہ شیمپین..... اب سنتا ہوں ریس پر بھی بندش لگانے کی سازش ہو رہی ہے۔'

'ارے ہاں'! بیگم کو ایکا ایکی یاد آیا۔ 'ابھی اگلے روز پروفیسر گھنشام کا خط آیا تھا۔ پرمیشن کے ہاتھوں بیچارہ مجبور ہوگیا ہے۔ ایک کیس وہسکی منگائی ہے' کسی طرح بھجوا دو' ڈیئر۔'

ایک غیر ملکی سفیر کا سیکریٹری دوسرے غیر ملکی سفیر کے سیکریٹری سے سرگوشی کر رہا تھا۔ 'مجھے کراچی میں دو چیزیں بہت پسند ہیں۔'

'مجھے تین۔' دوسرے نے کہا۔

'پارسی لڑکیاں' اور مسلمان عورتوں کے برقعے۔'

'مجھے برقعے والیاں بھی پسند ہیں!'

'واللہ بڑے کورمذاق ہو۔ ان مدقوق عورتوں کو کون چاہے گا بھلا؟'

'انہیں میں چاہتا ہوں۔ یسوع مسیح کی قسم' مجھے یہ بیمار حسن پسند ہے۔ پیلے پیلے گالوں میں نیلی نیلی رگوں کی لکیریں' اس پر غازے کا غبار..... خزاں کے موسم میں گلاب کی پتیاں..... ہائے میں نے ایسا حسین امتزاج کہیں نہیں دیکھا..... بوائے دو سو ڈاوو وہسکی۔'

'ایک ہی بات ہے تم پلاؤ یا میں پلاؤں..... ہمارے دونوں ملکوں کا بلند نصب العین مشترک ہے۔ ہم اس اشتراک کو مستقل بنانے کی ہر ممکن کوشش کریں گے..... تمہاری صحت کے لئے۔'

ایک مسلمان ایڈیٹر لیمن سکوائش سے جی بہلا رہا تھا۔ موقع پا کر وہ شراب اور کپڑے کے ایک بڑے تاجر کو گھیر کر کھڑا ہو گیا۔

'میں نے سنا ہے کہ پاکستان بننے کے بعد کراچی اور لاہور میں ولایتی شراب کی کھپت پہلے سے تگنی ہوگئی ہے؟' ایڈیٹر نے اپنے ایڈیٹوریل کے لئے مواد اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔

'غلط' تاجر نے گرم جوشی سے تنقید کی۔ 'بالکل غلط' آپ بھی کیا عجیب افواہیں لے اڑتے ہیں۔ تگنی تو کیا اگر دگنی بھی ہو جائے تو غنیمت ہے۔'

'افسوس' ایڈیٹر نے اصرار کیا۔ 'کیا یہ امر اس نئی اسلامی مملکت کے لئے شرمناک نہیں؟'

'پاکستان دنیا کا پانچواں بڑا اور مسلم ممالک میں سب سے بڑا ہے۔' تاجر نے ایڈیٹر صاحب کی معلومات میں اضافہ کرنے کی کوشش کی'

'کیا یہ امر اس سب سے بڑے مسلم ملک کے لئے شرمناک نہیں؟ ایڈیٹر صاحب برابر مصر تھے۔

'قبلہ' تاجر نے وہسکی کا لمبا سا گھونٹ بھر کر کہا۔ 'آپ ریاست بنا رہے ہیں۔ مسجد نہیں.....'

'وہ کالے کالے برقعے۔' دوسرے غیر ملکی سفیر کا سیکریٹری پہلے غیر ملکی سفیر کے سیکریٹری سے کہہ رہا تھا۔ 'سرخ و سبز ریشم کے سرسراتے ہوئے نقاب' برقعوں کی اوٹ میں جھانکتے ہوئے گول گول' پیلے پیلے' لال لال چہرے' سڈول بانہیں۔ ریشم کی تہوں سے جھلکتے ہوئے مخروطی

ہاتھ..... کنواری مریم کی عصمت کی قسم، میں نے ایسے برقپارے کہیں نہیں دیکھے۔ جب میں انہیں الفنسٹن سٹریٹ کی دکانوں میں بجلیاں گراتے دیکھتا ہوں تو میرا جی بے اختیار چاہتا ہے کہ میں ان کے قدموں میں گر جاؤں اور انکے نازک اور سبک پاؤں مجھے اپنی ٹھوکروں سے روندتے چلے جائیں، روندتے چلے جائیں'.....

'بوائے دو پیگ وہسکی اور سوڈا' پہلے نے آواز دی۔

'اس بار میری طرف سے۔ بوائے! دو سوڈا' دوو ہسکی۔' دوسرے نے کہا۔

'ایک ہی بات ہے، تم پلاؤ یا میں پلاؤں..... ہمارے بہادر ملکوں کا نصب العین ایک ہی ہے۔ ہم پاکستان کے خانہ بدوش مہاجرین کی مدد کریں گے۔'

'یہ دونی کھوٹی ہے، جی۔' بس کے کنڈکٹر نے کرختگی سے کہا..... 'اسے بدل دو۔'

'یہ دونی میں نے نہیں بنائی۔' پنجابی پیسنجر نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ 'میں یہ دونی کوئی دلی یا لکھنو سے نہیں لایا۔ میں تمہیں ہرگز دوسری دونی نہیں دوں گا۔'

'کنڈکٹر نے بس روک دی۔' جب تک تم مجھے دوسری دونی نہیں دو گے یہ بس آگے نہیں جائے گی۔'

کچھ پنجابیوں نے کنڈکٹر کو چند فصیح و بلیغ گالیاں دیں۔ 'سالے سندھی' مفت پاکستان مل گیا سالوں کو، ہم بھی دو دن میں مزاج ٹھکانے لگا دیں گے، ہاں۔'

کنڈکٹر اور ڈرائیور باہر نکل کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ 'سالے پنجابی' پٹ پٹا کر یہاں آئے تو سالوں کا دماغ ہی نہیں ملتا۔ سر پر ہی چڑھے آتے ہیں، سور کے بچے، جیسے انکی ماں کے خصم کا گھر ہے یہاں۔'

ایک ہندو راہ گیر یہ قصیدہ سن کر ٹھہر گیا اور داد کے طور پر اس نے کنڈکٹر اور ڈرائیور کو ایک ایک بیڑی پیش کی۔

دو بنگالی یہ ہنگامہ دیکھ کر بس سے نیچے اتر آئے۔

'لارنس روڈ کتنی دور ہے جی؟' ایک نے پوچھا۔

'یہی کوئی دو فرلانگ اور ہو گی۔' دوسرے نے اندازہ لگایا۔

'آؤ ٹہلتے ہی چلیں۔'

جب وہ دونوں بس سے ایک محفوظ فاصلے پر پہنچ گئے تو انہوں نے دونی والے حادثہ پر دل کھول کر تبصرہ کیا۔ 'لڑنے دو' سالے سندھیوں اور پنجابیوں کو' کہتے ہیں پاکستان کی قومی زبان اردو ہو گی۔ چھی' گویا شرنو بنگلہ بھاشا ہماری قومی زبان ہی نہیں..... چھی.....'

صدر کے چوک میں ایک ایرانی ہوٹل والا' ایک چھابڑی والے پر گرج رہا تھا۔ 'تم یہ گندے کیلے یہاں نہیں رکھ سکتے۔ میرے ہوٹل میں مکھیاں آتی ہیں..... ہیں۔'

'ابے چل، ہوٹل کے بچے۔' چھابڑی والا اکڑ رہا تھا۔ 'یہ پٹڑی تیرے باوا کی ہے؟'

ایرانی نژاد ہوٹل والے نے پاؤں کی ایک بھرپور ٹھوکر سے کیلوں کی چھابڑی الٹ دی۔ چھابڑی والا لپک کر اسکی ٹانگوں سے چمٹ گیا۔ ایک کانسٹیبل نے آ کر چھابڑی والے کے منہ پر زور کا تھپڑ مارا۔ 'سالے حرامی کتنی بار کہا ہے' یہاں بکری مت کرو لیکن سنتے ہی نہیں حرام زادے چلو' تھانے چلو۔'

چھابڑی والے نے گڑگڑا کر خوشامد کی' کہ داروغہ جی' میں اجمیر شریف سے آیا ہوں۔ میرا گھر بار سب لٹ گیا ہے۔ میری اندھی بہن میرے ساتھ ہے۔ مجھے چھوڑ دو۔ میں پھر یہاں چھابڑی نہیں لگاؤں گا۔

لیکن قانون' قانون ہے۔ قانون کی نظر میں نہ اجمیری کا امتیاز ہے نہ لاہوری کا۔ نہ اندھی بہن کی تمیز ہے۔ نہ آنکھوں والی کی۔ کانسٹیبل نے اپنا فرض منصبی بڑے احسن طریقے سے انجام دیا اور چھابڑی والے کو آگے لگا کر تھانے لے گیا..... جب تھانیدار نے اندھی بہن کی کہانی سنی تو اسے کانسٹیبل کی نالائقی پر بڑا غصہ آیا کہ کیوں نہ وہ اسکی اندھی بہن کو بھی ساتھ ہی لیتا آیا.....

'دو اور دو چار..... چار اور تین سات..... سات اور نو کے ہوئے؟' چیلا رام دلال نے خوشی محمد دلال سے پوچھا۔

خوشی محمد دلال چائے سے مکھی نکال کر چمچہ چھٹک رہا تھا۔ ادھ موئی مکھی فرش پر گرا کر اس نے چائے کا ایک لمبا سا گھونٹ بھرا۔

'سات اور نو سولہ' چیلا رام نے خود ہی حساب لگایا۔ 'میں نے کہا استاد سیزن برا نہیں رہا۔'

خوشی محمد دلال نے اپنا لٹکا ہوا نچلا ہونٹ سمیٹ کر چائے کا ایک لمبا سا گھونٹ لیا۔

'سچ پوچھو تو دوست بڑا کرارہ سیزن لگا تھا۔' چیلا رام کے گالوں کی کچوریاں خوشی سے پھول رہی تھیں۔ 'ایک سیزن میں سولہ چھوکریاں! رام قسم میں نے تو ایسا دھندہ ساری عمر نہیں کیا تھا۔'

اطمینان قلب کے اظہار کے طور پر چیلا رام نے چاند تارے والی جناح کیپ اتار کر اپنی گنجی چندیا کو زور زور سے سہلایا۔

خوشی محمد کا لٹکا ہوا نچلا ہونٹ اور بھی لٹک گیا۔ اور ردعمل کے طور پر اس نے چائے کا ایک طویل سا گھونٹ سڑاپ لیا۔

'تم سالے قسمت کے دھنی ہو۔' خوشی محمد منمنایا۔ 'چھوکری پر چھوکری اتارتے تھے۔ یہاں مشکل سے صرف تین ہاتھ آئیں۔'

'تین چھوکریاں! تھو!!' چیلا رام نے طنزاً ریسٹوران کے فرش پر بلغم کا ایک بڑا سا فلقہ تھوک دیا۔ 'کالی کالی پوربنیں۔ کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا تھا تھو..... میرے پاس بڑے انمول دانے تھے یار..... گرم گرم' سخت سخت پنجابنیں۔ نازک لچک دار دلی والیاں اور پھر وہ پٹیالے والی جٹنی' ہائے ہیرا تھی' خوشی محمد ہیرا!'

چیلا رام نے ایک کھارا بسکٹ انگلیوں کے درمیان دبا کر توڑ ڈالا۔

'وہ سالا براؤن اسے پورٹ سعید لے گیا۔ کہتا تھا' بڑا کام دے گی وہاں..... میں نے کہا خوشی محمد یہ پورٹ سعید کس طرف ہے؟'

'ہوگی کہیں۔' خوشی محمد کا کاروبار ذرا مندا تھا۔ 'چائے منگواؤ اب تو سالی کوئی ریفیوجی ٹرین بھی نہیں آتی۔'

گرم چائے کے کپ پر وہ دونوں پھر اپنے اپنے خیالوں کی دنیا میں کھو گئے۔ چیلا رام دلال اپنے انمول دانوں کا حساب لگا رہا تھا۔ جو اسکے اپنے ہاتھوں سے نکل کر روئے زمین کے مختلف حصوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ قاہرہ..... لندن..... پورٹ سعید..... نہ جانے

اسکے بیش قیمت تحفے کس کس شبستان کی زینت بنے ہوئے تھے کسی دمکدار آرام گاہ میں اس پٹیالے والی جٹنی کا جسم بھی ریشمی اور کمخواب کے گاؤ تکیے کی طرح سجا ہوا ہوگا..... چیلا رام کے دل میں عجیب عجیب قسم کی آرزوئیں سر اٹھا رہی تھیں۔ ایک بار اسکا جی چاہا کہ وہ پر لگا کر پورٹ سعید جا پہنچے اور پانچ سو ستر روپے کے نوٹ سالے براؤن کے منہ پر مار کے پٹیالے کی جٹنی کو واپس لے لے اور اس کے گتھے ہوئے مخملیں گاؤ تکیے ایسے جسم کو بانہوں پر اٹھا کر بھاگ آئے۔ طوفانوں سے لڑتا ہوا' سمندر کی لہروں سے ٹکراتا ہوا' پہاڑوں کی چھاتی کر چیرتا ہوا.....

خوشی محمد دلال کی دنیا میں غم اور غصے کا دھواں چھایا ہوا تھا۔ پہلے تو یہ سالے ریفیوجی ہوائی جہازوں میں بھر کر لائے جاتے تھے۔ ٹرینوں پر ٹرینیں لدی ہوئی آتی تھیں..... لیکن اب کچھ دنوں سے بازار سرد تھا۔ وہ ہر روز اخباروں میں نئی خبریں پڑھتا تھا..... دلی میں خون..... کانپور میں خون..... کلکتے میں خون..... احمد آباد میں خون..... اجمیر میں خون..... لیکن اس سالے خون کے ریلے میں ایک ریفیوجی ٹرین بھی کراچی نہ پہنچتی تھی۔ خوشی محمد دلال کو اس بات کا سخت قلق تھا۔ پھر بھی اس نے کسی موہم سی امید کا سہارا لے کر چھ پیسوں کا خون کیا اور اخبار کی جلی سرخیوں پر للچائی ہوئی نظر دوڑائی۔ اخبار بیچنے والا چھوکرا گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔ 'اب تو کشمیر میں بھی چھڑ گئی..... جموں میں لاکھوں مسلمانوں کا خون ہو گیا.....

'اب تو.....'

خوشی محمد دلال نے ہمہ تن شوق ہو کر خبریں پڑھیں۔ کشمیر کی جنت میں بھی دوزخ کے شعلے بھڑک اٹھے تھے زعفران کے کھیتوں پر آگ برس رہی تھی۔ پھولوں کے دامن میں شرر جل رہے تھے۔ نسیم بہار کی جگہ ڈوگروں کی تلوار چل رہی تھی۔ ہزاروں مر گئے تھے' ہزاروں مر رہے تھے ہزاروں مینڈکوں کی طرح چھپ چھپ کر' چوہوں کی طرح رینگ رینگ کر اس آتش کدۂ جہنم سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔

خوشی محمد نے چیلا رام کی ران پر زور سے ہاتھ مارا۔ 'اب تو کشمیر میں بھی لگ گئی' میرے یار۔ میں نے کہا' چیلا رام ذرا سن لو۔'

چیلا رام پورٹ سعید کے تصور میں مگن تھا۔ 'پھر تو سیب مہنگے ہو جائیں گے؟' اس نے بے توجہی سے پوچھا۔

لیکن خوشی محمد میں شاعری کی روح حلول کر آئی تھی۔ اسنے چٹخارے لے لے کر کشمیر کی نازک بدن' سیم تن عورتوں کا ذکر سنایا۔ خوبصورت رنگین' کلغد ار عورتیں..... جن کے گالوں میں سیب ہوتے ہیں۔ چھاتی پر ناشپاتیاں۔ ہونٹوں پر انگور کا رس آنکھوں میں ڈل کی لہروں پر رقصیدہ کنول۔ گلے میں پہاڑی جھرنوں کا سرود۔ انگ انگ میں گلاب اور موتیے کی رنگت۔ زعفران کی بھیگی بھیگی مہک.....'

چیلا رام دلال کے منہ سے رال ٹپکنے لگی۔ وہ آنکھیں مل مل کر اٹھ بیٹھا اور خوشی محمد کے لئے اس نے چائے کا تیسرا کپ بھی منگوایا۔ پھر وہ سر سے سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور کشمیر کے سیزن کی امید افزا عنایتوں میں کھو گئے.....'

ہوا کے تھپیڑوں سے بادباں لہرایا۔ موجوں میں ایک ہلکا سا تلاطم اٹھا..... کشتی ڈگمگائی اور وہ سہم کر سیٹھ قائم علی دائم علی کے پہلو سے لگ گئی۔ سیٹھ قائم علی دائم علی کی توند میں ہنسی کا جوار بھاٹا سا اٹھا اور پان کی پیک جو کچھ عرصہ سے اس کے منہ میں جمع ہو رہی تھی' بے اختیار بدرو کے

گندے پانی کی طرح بہ نکلی۔

بوڑھا ملاح بیڑی سلگا کر مسکرایا۔ 'کشمیر سے آئی ہے سیٹھ' اندھی ہے' بولو کس طرف چلوں؟ پیرس یا وینس؟'

سیٹھ قائم علی دائم علی کا ایک دفتر پیرس میں بھی تھا۔ یوں بھی اس نے پیرس کے متعلق بڑی دلآویز باتیں سن رکھی تھیں لیکن اس وقت وہ اس چھوٹی سی ڈگمگاتی ہوئی کشتی میں اتنے لمبے سفر پر جانے کے لئے ہرگز تیار نہیں تھا۔ چنانچہ جب ملاح نے اسے پیرس یا وینس چلنے کی دعوت دی تو وہ بوکھلا گیا۔

چالاک ملاح اسکی بوکھلاہٹ پر مسکرایا۔ 'گھبراؤ نہیں سیٹھ' دور نہیں لے جاؤں گا' ہا! کیا جگہ ہے پیرس بھی! دیکھو گے تو مر جاؤ گے' ہا'

کیماڑی کی بندرگاہ میں خاصی چہل پہل تھی۔ اتوار کی چھٹی منانے والے ہجوم ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ کوئی منوڑا جا رہا تھا' کوئی سینڈ پٹ آئی لینڈ..... اور ایک جہاز بمبئی جانے کے لئے لنگر اٹھا رہا تھا۔ جہاز کے ڈیک پر سینکڑوں رنگین ساڑھیاں پھڑ پھڑا رہی تھیں۔ لوگ دوربینیں آنکھوں سے لگائے کراچی کی آخری جھلک دیکھ رہے تھے۔ جب جہاز روانہ ہوا تو کچھ لوگوں نے اپنے سروں سے جناح ٹوپیاں اتار کر سمندر میں پھینک دیں اور ہوا میں گھونسے لہرا لہرا کر 'جے ہند' کا نعرہ لگایا۔

کشمیر کی اندھی دوشیزہ سیٹھ قائم علی دائم علی کے پہلو سے لگی ایک گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جب لہروں کے طلاطم پر کشتی کا سینہ ڈگمگاتا تو اسے اپنا ہلکا پھلکا شکارا یاد آتا' جو اسی طرح ڈل اور وولر کی نازک لہروں پر تھرتھرایا کرتا تھا۔ پہلے دن جب اس نے سمندر کا چلو بھر پانی پیا تو اسے قے آ گئی..... اف کتنا کڑوا پانی تھا۔ ڈل کا پانی تو تازہ دودھ کی طرح میٹھا تھا اور چشمہ شاہی کا پانی..... ہائے جیسے دودھ اور مکھن اور شہد کو برف میں لگا کر پیا جائے وہ چاہتی تھی کہ ایک بار اس کڑوی جھیل کو بھی دیکھے کہ اسکا پانی کالا ہے یا سرخ؟ نیلا ہے یا سبزہ؟ لیکن ہائے اسکی آنکھیں! ایک دن تھا کہ اسکی غلافی آنکھوں میں جھیل وولر کی لطیف نیلاہٹ اور کچے باداموں کی نازک راحت ہوا کرتی تھی لیکن اب ان کی جگہ گہرے گہرے زخم تھے۔ جیسے دو اندھے اور تاریک کنویں کسی دور دراز ویرانے میں کھوئے پڑے ہوں..... اب وہ اندھی تھی' بے بصر تھی' ایک بہادر ڈوگر نے اپنی سنگین سے اسکی آنکھوں میں بسے ہوئے طلسمی رنگ محل مسمار کر دیئے تھے'

ساحل کے ہنگامے سے دور' ایک کالے رنگ کا جہاز سمندر میں تنہا کھڑا تھا اس پر سرخ رنگ کے جلی حروف میں لکھا تھا کہ اس میں بارود ہے۔ جب کشتی پاس سے گزرتی تو سیٹھ قائم علی دائم علی نے جلدی سے لڑکی کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ معاً اسے ڈر لگا کہ کہیں بارود بھک سے اڑ نہ جائے..... جب کشتی ذرا دور نکل گئی تو سیٹھ قائم علی دائم علی نے پھر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنی توند پر رکھ لئے۔

کشتی ایک چھوٹے سے جزیرے سے جا لگی۔ جزیرے میں چند ماہی گیروں کی جھونپڑیاں تھیں۔ ملاح نے بتایا کہ اس عشرت کدے کا نام پیرس ہے۔ آس پاس اور بھی چند جزیرے تھے' انکے ساحلوں پر بھی اکا دکا کشتیاں کھڑی تھیں۔ کہیں وینس تھا' کہیں نیپلز..... کہیں روم'

ملاح نے بادبان کھول کر کشتی پر ایک سائبان سا تان دیا۔ پھر اس نے سیٹھ قائم علی دائم علی کو آنکھ ماری۔ 'لو سیٹھ میں تو مچھلیاں پکڑنے چلا..... تم مزے سے کشمیر کی بہاریں لوٹو.....'

عید گاہ کے میدان میں ایک مینا بازار لگا ہوا ہے۔ یہاں ہر روز عید ہے ہر شب شب برات! ٹاٹ کی چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں میں ننھے ننھے

چراغ ٹمٹمارہے ہیں۔گوشت روٹی' سلے ہوئے کپڑے'پرانے بوٹ'تازے پھل'لوہے کی میخیں'لکڑی کے صندوق'چمڑے کی کرسیاں'تیل'اچار'صابن..... بے گھر اور بے در مہاجر سہارے کی ہر ممکن لڑی تھام کر بیٹھے ہوئے تھے۔ایک عجیب قسم کا اطمینان'ایک عجیب قسم کی ابدیت اس ماحول پر جاری وساری ہے..... جسے دیکھ کر یہ گمان ہوتا ہے کہ زندگی کا یہ بھٹکا ہوا کارواں آخر اپنی منزل مقصود پر پہنچ گیا ہے۔

ایک جھونپڑی میں چادر تان کر دو حصے کیے ہوئے ہیں۔سامنے کی طرف دلشاد پکوڑیاں تل رہی ہے۔پچھلی طرف ذبیدہ دہی بڑے لگائے بیٹھی ہے۔

ایک لمبا تڑنگا پٹھان پکوڑیوں کے سامنے پھسکڑا مارے بیٹھا ہے۔

'گرم گرم پکوڑیاں ہیں'خان'.....کھالو.....بولو کتنے کی دوں؟'

'نرم ہے'خو'گرم ہے؟'پٹھان نے آنکھ ماری۔

'ہاں خان !نرم ہے'خو'گرم ہے؟'دلشاد کڑچھی منہ کے سامنے رکھ کے مسکرائی۔

دلشاد کی مسکراہٹ میں بھی عجیب جادو تھا۔اسکی ایک مسکراہٹ پر نثار ہو کر رحیم خاں نے قسم کھالی تھی کہ اگر سورج یا چاند یا تارے بھی اسے اٹھا لے جائیں گے تو وہ ارض وسما کی وسعتیں پھاند کر اسے چھین لائے گا۔'

پٹھان نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔'خو ایک روپیہ؟'

'نہیں خان'خو پانچ روپیہ.....'

'ہٹ'خو'ڈھائی روپیہ؟'

'خو پانچ۔'

پٹھان نے اپنی جیب سے پیسے گنے۔اسکے پاس تین روپے چار آنے تھے اسنے پونے دو روپیہ کا ادھار کرنا چاہا لیکن دلشاد نے اسے مجبور کر دیا کہ خان'قرض محبت کی قینچی ہے۔تم پیسے پورے کرلاؤ میں تمہیں جھٹ پٹ نرم نرم'گرم گرم پکوڑیاں اتار دوں گی۔'

پٹھان مایوس ہو کر دوسری طرف چلا گیا۔وہاں اسنے دہی بڑوں کا سودا کیا.....ذبیدہ ابھی بچہ تھی'نادان تھی'معصوم تھی'اسلئے وہ پونے دو روپے کا ادھار مان گئی۔

ذبیدہ نے دلشاد کو آواز دی۔'بہن ذرا اس طرف دھیان رکھنا محمود سو رہا ہے۔میں ذرا خان کے ساتھ جا کر دہی لے آؤں۔'

اسی طرح جب دلشاد بھی اپنی پکوڑیوں کے لئے بیسن لینے کسی گاہک کے ساتھ جاتی ہے تو اپنی بچی ذبیدہ کے سپرد کر جاتی ہے۔دہی اور بیسن کی اس ملاوٹ پر دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کا مستقبل پروان چڑھ رہا ہے۔جب دلشاد کی بچی نرم نرم'گرم گرم پکوڑیوں پر پل کر جوان ہوگی۔جب ذبیدہ کا محمود دہی بڑوں کی چاٹ پر سیانا ہوگا تو اسلام کی برادری میں دو گرانقدر رکنوں کا اضافہ ہو جائے گا۔ایک مضبوط بھائی'ایک خوبصورت بہن.....جسم کی مضبوطی اور جسم کی خوبصورتی !یہی تو وہ نعمت عظمیٰ ہے'جو نعمتوں والے'عظمتوں والے باری تعالیٰ نے تم

کوعطا کی ہے۔وہ تو بڑا ہی رحیم اور شفیق آقا ہے۔وہی مشرق کا مالک ہے وہی مغرب کا مولا ہے۔اسی نے درختوں پر خرمے اور انار لگائے۔وہی دریاؤں سے موتی اور مونگے نکالتا ہے۔وہی جنت کا رحمان ہے وہی دوزخ کا قہار ہے.....پھر تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟